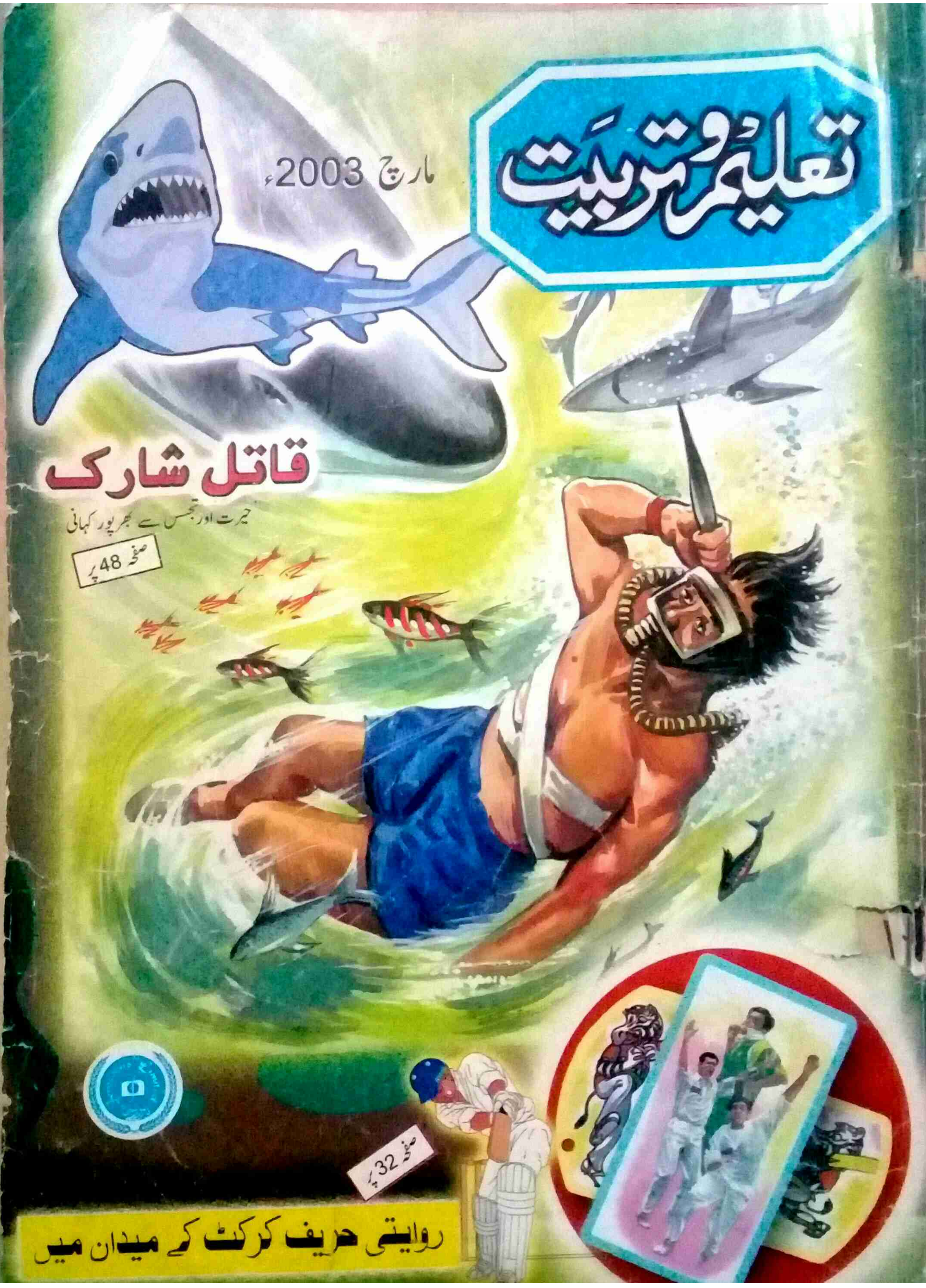

تعلیم و تربیت
مارچ 2003ء
قاتل شارک
حیرت اور تجسس سے بھرپور کہانی
صفحہ 48 پر
صفحہ 32 پر
روایتی حریف کرکٹ کے میدان میں

62واں سال۔ بارہواں شمارہ پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

(رُکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی)

تعلیم و تربیت

چیف ایڈیٹر: عبدالسلام
ایڈیٹر/پبلشر: ظہیر سلام
مشیر خاص: سید مقبول حسین شاہ
مشیر: سعید لخت
اسسٹنٹ ایڈیٹر: محمد جاوید امتیازی
انچارج آرٹ: سید شوکت اعجاز
سرکولیشن سپروائزر: محمد بشیر راہی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

خداوند تعالیٰ آپ سب کو ہر لمحہ خوش و خرم رکھے اور ہر قدم پر کامیاب کرے آمین۔ اس ماہ نئے اسلامی سال (1424ھ) کی ابتدا ہو رہی ہے اور اتفاق دیکھیے کہ "یوم پاکستان" (23 مارچ 2003ء) اور عاشورہ (10 محرم الحرام 1424ھ) کا دن بھی اسی مہینے میں آ رہا ہے۔ اس لحاظ سے جہاں نیا اسلامی سال ہم مسلمانوں کو اتفاق و یگانگت اور محبت و اخوت کا درس دیتا ہے وہاں نئے جذبے اور نئی منصوبہ بندی کے ساتھ تعلیم و ترقی کا بھی تقاضا کرتا ہے کیونکہ معاشرتی بدامنی، بے راہروی اور غربت و افلاس کے تمام مسائل کا حل اُسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب ہمارے یہاں تعلیم عام ہو گی۔ اپنے ماضی کی طرف مڑ کر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ 23 مارچ 1940ء کا دن اپنے آپ کو پرکھنے اور منزل کے تعین کا دن تھا۔ آزادی کی یہ تحریک جن قربانیوں کے بعد کامیابی سے ہمکنار ہوئی ان کا تقاضا ہے کہ ہماری قومی زندگی کا ہر آنے والا دن محنت و کوشش اور تعمیری سوچ کا آئینہ دار ہو۔

کسی قسم کی اخلاقی یا معاشرتی برائی ہو یا راستے کی رکاوٹیں ہوں، یقین و ایمان کی قوت سے انہیں سرنگوں کرنے اور اُن سب پر قابو پانے کے بعد ہی انسان منزل کی طرف قدم بڑھا سکتا ہے۔ ....

یقین و ایمان کی قوت حاصل کرنے کے لیے معرکہ کربلا میں حضرت امام حسینؑ اور آپ کے جاں نثار ساتھیوں کی لازوال قربانیاں یقیناً ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔

ساتھیو! خوب علم حاصل کرو، دل لگا کر پڑھو، محنت کرو اور ترقی کی جانب قدم بڑھاتے چلے جاؤ۔ "تعلیم و تربیت" کا یہی مدعا ہے اور یہی نئے اسلامی سال کا اصل تقاضا بھی! میرے بچو، وعدہ رہا نا!.......... (ایڈیٹر)

اس شمارے میں

ہمارا پاکستان (نظم)	رشید ارشد	2
درسِ قرآن	ڈاکٹر عبدالرؤف	3
گلشن منزل (حدیث کہانی)	نذیر انبالوی	4
روبوٹ کہانی (قسط 2)	حسن ذکی کاظمی	9
راستہ	محمد شعیب مرزا	14
منزل مراد	جمشید اختر	16
گھوں گھوں	اشتیاق احمد	19
صحت کی حفاظت	محمد جاوید امتیازی	22
سن لو پیارے بچو (نظم)	محمد اسحاق جلالپوری	24
صحراؤں کی سرزمین (3)	ڈاکٹر محمد اقبال ثاقب	25
پربت کے اُس پار	حامد مشہود	28
کھیل اور کھلاڑی	سید شوکت اعجاز	32
کارٹون کہانی	شاہد ریاض شاہد	36
حیران کن	سید شوکت اعجاز	41
ڈوڈو اور ڈوڈی	محمد معروف چشتی	46
قاتل شارک	جنید احمد	48
ضمیر کی آواز	وجیہہ طاہر	51
مجرم کیسے گرفتار ہوا	زبیدہ سلطانہ	52
جو کرتے ہیں دنیا میں محنت زیادہ	جاوید امتیازی	57
مات اور بات (نظم)	تاج انصاری	58
نیٹ ورک (3)	منظر رضا ہاشمی	59

باقی دلچسپ سلسلے حسب معمول

سرورق: قاتل شارک

آئندہ شمارے میں

چچا حیرت کے کیا کہنے!

"چچا حیرت غصے سے دھاڑے: بے شرم! مذاق اُڑاتے ہو ہمارا۔ ارے ہم لٹ پونجیے ہیں کیا؟ پیسے نہیں دے سکتے تو الٹا مانگنے بیٹھ گئے، فقیر کہیں کے!" وہ غصے میں الا بلا بولتے ہوئے باہر نکل گئے۔ عیدے اور شیدے نے انہیں بہت آوازیں دیں مگر انہوں نے ایک نہ سنی.............."

معروف مزاح نگار محمد اوریس قریشی آئندہ ماہ آپ کے لیے لا رہے ہیں نہایت دلچسپ کہانی، جسے پڑھ کر آپ بھی پکار اٹھیں گے: "واہ وا! چچا حیرت کے کیا کہنے!"

مارچ 2003ء

قیمت فی پرچہ: 15 روپے

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ایمپریس روڈ، لاہور
U.A.N: 042-111-62-62-62 Fax: 042-6369204
Email: support@ferozsons.com.pk
Website: http://www.taleemotarbiat.com

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت بنک ڈرافٹ، چیک یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ایمپریس روڈ، لاہور کے پتہ پر ارسال کریں۔
فون: 6361309-6361310-6278815 فیکس: 6278816

سالانہ قیمت: پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) =/345 روپے۔ مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ (ہوائی ڈاک سے) =750 روپے۔
یورپ (ہوائی ڈاک سے) =830 روپے۔ امریکا اور مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) =950 روپے۔

پرنٹر: عبدالسلام، مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60۔ شاہراہ قائداعظم لاہور

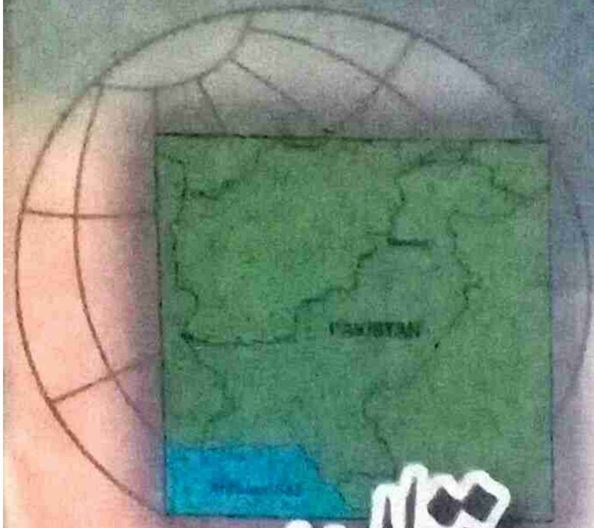

ہمارا پاکستان

عظمت کا مینار ہمارا پاکستان !
فولادی دیوار ہمارا پاکستان !
دکھیوں کا غم خوار ہمارا پاکستان !
سب کو بانٹے پیار ہمارا پاکستان !
اک دنیا آباد ہے اس کے سائے تلے !
شجر سایہ دار ہمارا پاکستان !
سرحد اس کی جاگتی آنکھیں ہیں سب کی !
ہر لمحہ بیدار ہمارا پاکستان !
کوہ و سمندر اُن کے اندر لعل و گہر !
قدرت کا شہکار ہمارا پاکستان !
اس کا خطہ خطہ گوشۂ جنت !
رشکِ ارم، گل زار ہمارا پاکستان !
غازی اور مجاہد اس کے باشندے !
بیدار و ہشیار ہمارا پاکستان !
اعدائے ملت کے حق میں اے ارشدؔ
اللہ کی تلوار ہمارا پاکستان !

رشید ارشد

قرآن حکیم میں جہاد کے بارے میں متعدد آیات موجود ہیں۔ جہاد کے معنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑنا ہے، تاکہ حق و انصاف کی بالادستی قائم ہو اور ظلم و ستم کا خاتمہ ہو۔ جب مسلمانوں کے دین اور زندگی کو خطرے لاحق ہوں تو جہاد سب پر فرض ہو جاتا ہے۔ جہاد تین صورتوں میں ہو سکتا ہے:

(1) اسلحہ کے ساتھ جہاد: یعنی اسلحہ سے مسلح ہو کر دشمن کے خلاف محض اللہ کی رضا کے لیے لڑنا۔ یہ جہاد کی سب سے بہتر قسم ہے۔

(2) قلم سے جہاد: برائیوں کے خلاف مضامین لکھنا اور ان کی مناسب نشر و اشاعت کرنا بھی جہاد ہے۔

(3) زبان سے جہاد: جہاد کی اس قسم میں ظلم اور بدی کے خلاف آواز بلند کرنا، تعمیری تقریریں کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

عصر حاضر کے اہم جہادی مورچے:

موجودہ زمانے میں اسلام اور مسلمانوں کو تین سمتوں سے سنگین خطرے درپیش ہیں۔ وقت کی تین "بڑی" طاقتیں وسیع پیمانے پر مسلمانوں سے ظلم و ستم اور انہیں نیست و نابود کرنے پر اتر آئی ہیں۔

ظلم و ستم کے خلاف جہاد: اسلام کے خلاف طرح طرح کی بے بنیاد نفرتیں پھیلانے اور مسلمانوں کے قتل و غارت میں اس وقت امریکا پیش پیش ہے۔ ستمبر 2001ء کے سانحہ کو بہانہ بنا کر وہ بغیر کسی سبب یا ثبوت کے مسلمانوں کو سخت ہراساں کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ ایسی قوتیں افغانستان میں بھی فساد برپا کیے ہوئے ہیں۔ سعودی عرب میں امریکی فوجیں ڈیرے جمائے ہوئے ہیں۔ عراق پر ایک عرصے سے مسلسل فوجی تشدد جاری رکھے ہوئے ہے۔ ایران کو بھی طرح طرح سے دھمکایا جا رہا ہے۔ اس قسم کے دھونس دھکے اور ظلم و بربریت کے خلاف ہر قسم کا جہاد عین نیکی ہے۔

فلسطین میں یہودی بربریت کے خلاف جہاد: فلسطین کے نہتے مسلمانوں پر تو اسرائیلی فوج نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی ہے۔ اس سمت میں بھی جہاد فرض ہے۔

کشمیر میں متعصب ہندو حکومت کے خلاف جہاد: مقبوضہ کشمیر میں متعصب ہندوستانی فوج نہتے کشمیریوں کے قتل عام میں نہایت درندگی سے مصروف ہے۔ اب تک تقریباً ایک لاکھ کشمیری مجاہد شہید کیے جا چکے ہیں۔ اس مورچے پر جہاد بھی بہترین نیکی ہے۔

قصہ مختصر: جہاد نیکی کا ایک ایسا عملی قدم ہے جو مسلمانوں کے خلاف ہر قسم کے ظلم و ستم کے انسداد کے لیے لازم ہے اور اس کے بغیر دنیا کا امن بھی قطعی ممکن نہیں۔

☆☆☆

گلشن منزل

نذیر انبالوی

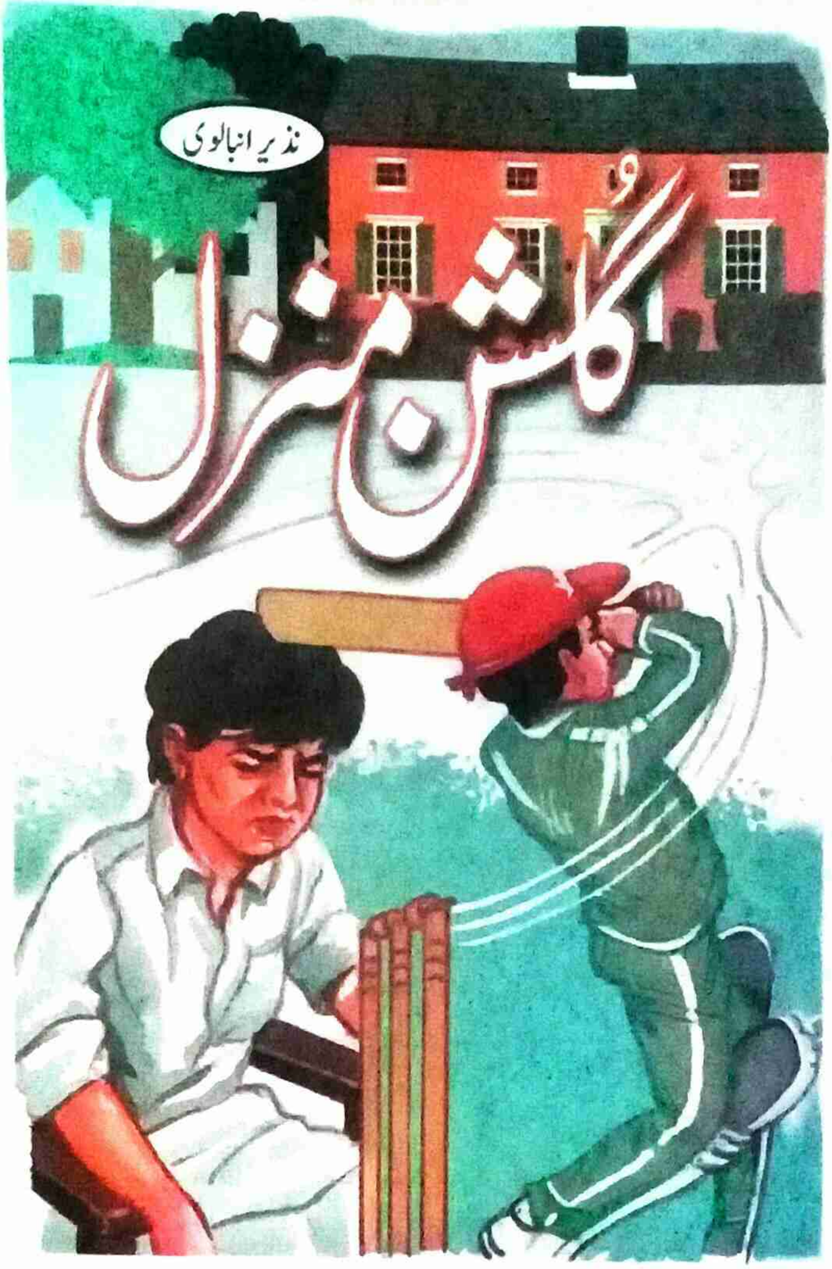

حارث گھر میں داخل ہوا تو دروازے کے پاس ٹوٹے فرش کے ایک گڑھے میں ایسا پاؤں پڑا کہ وہ مشکل سے گرتے گرتے بچا۔ گھر کے ٹوٹے پھوٹے صحن میں کھڑے ہو کر اس نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی تو اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے پلستر اتری دیواریں‘ پرانے دروازے‘ بدنما کھڑکیاں اور جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا فرش اس کو خوش آمدید کہہ رہے ہوں۔ ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ اس گھر میں دو ہی تو کمرے تھے۔ ایک کمرہ سامان سے بھرا پڑا تھا جب کہ دوسرا کمرہ مہمانوں کے لیے تھا اس میں چند پرانی کرسیاں اور ایک بے رنگ میز پڑی تھی۔ یہ کمرہ مہمانوں کے علاوہ پڑھائی لکھائی‘ کھانے پینے اور رات کے وقت سونے کے لیے بھی کام آتا تھا۔ دونوں کمروں کے آگے ایک چھوٹا سا برآمدہ بھی تھا جس میں چولہا اور گھر کی فالتو چیزیں رکھی تھیں۔ حارث اب برآمدے کی اتری ہوئی سفیدی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی امی جان اس کے لیے گرم گرم روٹی پکانے میں مصروف تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ حارث کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ امی جان نے حارث کا چہرہ دیکھ کر سب کچھ جان لیا تھا۔

”کیا آج پھر ذیشان کے گھر گئے تھے؟“

”نہیں“ حارث نے اپنا بستہ برآمدے کے کونے میں کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

”پھر منہ کیوں لٹکا ہوا ہے۔ کیا سکول میں کوئی بات ہوئی ہے؟ امی جان نے پوچھا۔

”نہیں“ حارث نے اپنے پرانے سے جوتے اتارتے کہا۔

”تو پھر کیوں اداس ہو؟“ امی جان بیتاب ہو کر بولیں۔

”یہ گھر ہے یا کھنڈر! کھنڈر بھی شاید ہمارے گھر سے خوبصورت ہو گا“ حارث نے اپنی پرانی جرسی غصے سے ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو یہ بات ہے۔ میں نے تمہیں کل شام ذیشان کے گھر جانے سے منع بھی کیا تھا مگر تم کب میری بات مانتے ہو۔ ذیشان کا گھر دیکھ کر تو تمہیں اپنا گھر کھنڈر ہی دکھائی دے گا۔ میرے بچے! وہاں مت جایا کرو“۔ امی جان نے روٹی توے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”میں ذیشان کے گھر جاؤں گا۔ جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا“ حارث ضد میں آکر بولتا چلا گیا۔

”ذیشان کے گھر جاؤ گے تو اداس ہو کر ہی آؤ گے“۔ امی جان نے کہہ تو دیا مگر ان کی باتوں کا حارث پر بھلا کب اثر ہوتا تھا۔ اس نے بددلی کے ساتھ تھوڑا بہت کھانا کھایا اور پھر حسبِ معمول اس کے قدم ذیشان کے گھر کی طرف بڑھ گئے۔ دو گلیاں پار کرنے کے بعد وہ ایک تین منزلہ گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ جس

کے دروازے پر "گلشن منزل" لکھا ہوا تھا۔ یہ مکان کچھ عرصہ قبل ہی تعمیر کیا گیا تھا۔ حارث نے مکان کے باہر لگے سنگ مرمر کو دیکھا تو اسے اچھا لگا۔ کھڑکیوں کے سبز رنگ کے شیشے اس کو بھلے لگ رہے تھے۔ اس نے کال بیل پر ہاتھ رکھا تو چند لمحوں بعد ذیشان دروازے پر موجود تھا:

"آؤ..... آؤ حارث آؤ۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا"۔

حارث بغیر کچھ کہے ذیشان کے ساتھ ہو لیا۔ چپس کا عمدہ فرش، سفید رنگ سے پینٹ کی گئیں دیواریں، لکڑی کے نفیس دروازے، روشن بلب اور ٹیوب لائٹ، کمرے میں موجود اعلیٰ فرنیچر اور فرش پر بچھا نرم نرم قالین گھر کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ ذیشان حارث کو دوسری منزل پر اپنے کمرے میں لے آیا۔ حارث نے حیران ہو کر پوچھا:

"کیا یہ کمرہ صرف تمہارے لیے ہے؟"

"ہاں یہ کمرہ صرف اور صرف میرا ہے۔ یہاں کی ہر چیز میری ہے"۔ ذیشان بولا۔

"تمہارے گھر میں کل کتنے کمرے ہیں؟" حارث نے پوچھا۔

"پندرہ کمرے اور ایک بڑا سا ڈرائنگ روم"۔ ذیشان نے جواب دیا۔

"پندرہ کمرے؟" حارث نے دہرایا۔

"ہاں پندرہ کمرے، پاپا تو کہہ رہے تھے کہ چوتھی منزل بھی بنے گی۔ بس یونہی انہیں امی جان نے روک دیا ورنہ مزید چار کمروں کا اضافہ ہو جاتا"۔ ذیشان آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولا۔

"کیا میں تمہارے گھر میں کبھی کبھار آسکتا ہوں؟" حارث نے پوچھا۔

"کبھی کبھار کیوں تم روز ہمارے گھر آسکتے ہو، بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ تم جب مرضی آؤ یہ تمہارا اپنا گھر ہے"۔ ذیشان کی بات سن کر حارث خوش ہو گیا۔

"آج میرے پاس تمہیں دکھانے کے لیے ایک چیز ہے"۔ ذیشان کمرے میں قدم رکھتے ہی بولا۔ "کیا ہے وہ چیز؟" حارث نے سوال کیا۔

"وہ دیکھو کل رات ہی میرے پاپا میرے لیے کمپیوٹر لائے ہیں۔ میں اپنے سکول میں کمپیوٹر سے متعلق بنیادی باتیں جان چکا تھا، اسی لیے یہ کمپیوٹر مجھے ملا ہے۔ کیا تمہارے سکول میں کمپیوٹر لیب ہے؟" ذیشان کے سوال پر حارث نے اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔

"تم فکر مت کرو میں تمہیں کمپیوٹر چلانے کا طریقہ بتا دوں گا۔ جب انٹرنیٹ کا کنکشن مل جائے گا تو ہم دنیا جہان کی ویب سائٹ کی وزٹ کریں گے"۔ حارث ذیشان کی باتوں کا ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ اس کی نگاہیں تو کمپیوٹر پر جمی ہوئی تھیں۔

دونوں نہ تو ایک گلی میں رہتے تھے اور نہ ایک سکول میں پڑھتے تھے۔ ان کی دوستی ایک قریبی کرکٹ گراؤنڈ میں ہوئی تھی۔ حارث اپنی گلی کے لڑکوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے کے لیے گیا تھا۔ گراؤنڈ میں پہنچ کر سب دوستوں نے فیصلہ کیا کہ آپس میں کھیلنے کی بجائے کسی دوسری ٹیم سے میچ کھیل لیتے ہیں۔ گلی نمبر 6 کے لڑکے جن میں ذیشان بھی شامل تھا ایک طرف کھیل رہے تھے۔ عثمان گلی نمبر 6 کے لڑکوں کی طرف بڑھا۔ "کیا ہمارے ساتھ میچ کھیلو گے؟"

"ہاں ضرور، ہم آپ لوگوں کے ساتھ ضرور میچ کھیلیں گے"۔ فد بولا۔

یوں سارے لڑکے ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ کھلاڑی گنے گئے۔ گلی نمبر 6 والوں کے کل کھلاڑی سات جب کہ حارث کی گلی کے کھلاڑی نو تھے۔ اب یہ طے پایا کہ گلی نمبر 6 والوں کو ایک کھلاڑی دے دیا جائے۔ یہ قرعہ حارث کے نام نکلا۔ حارث اب گلی نمبر 6 کی ٹیم میں شامل تھا۔ میچ کا آغاز ہوا۔ دس اوورز کے میچ میں حارث کی گلی والوں نے پہلے کھیلتے ہوئے پچاس سکور کیے۔ جب گلی نمبر 6 والوں کی باری آئی تو افتتاحی بلے بازوں میں ذیشان اور حارث کھیلنے کے لیے آئے۔ دونوں نے عمدہ بیٹنگ کا مظاہرہ کیا اور آٹھ اوورز ہی میں اپنی ٹیم کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔ حارث نے پانچ چوکوں اور ایک چھکے کی مدد سے 36 رنز بنائے تھے جب کہ ذیشان نے گیارہ رنز بنائے تھے۔

"تم تو بہت عمدہ کھیلتے ہو۔ آج سے تم ہماری ٹیم کی طرف ہی سے کھیلا کرو گے"۔ ذیشان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اس دن کے بعد دونوں کی دوستی گراؤنڈ سے بڑھتے بڑھتے

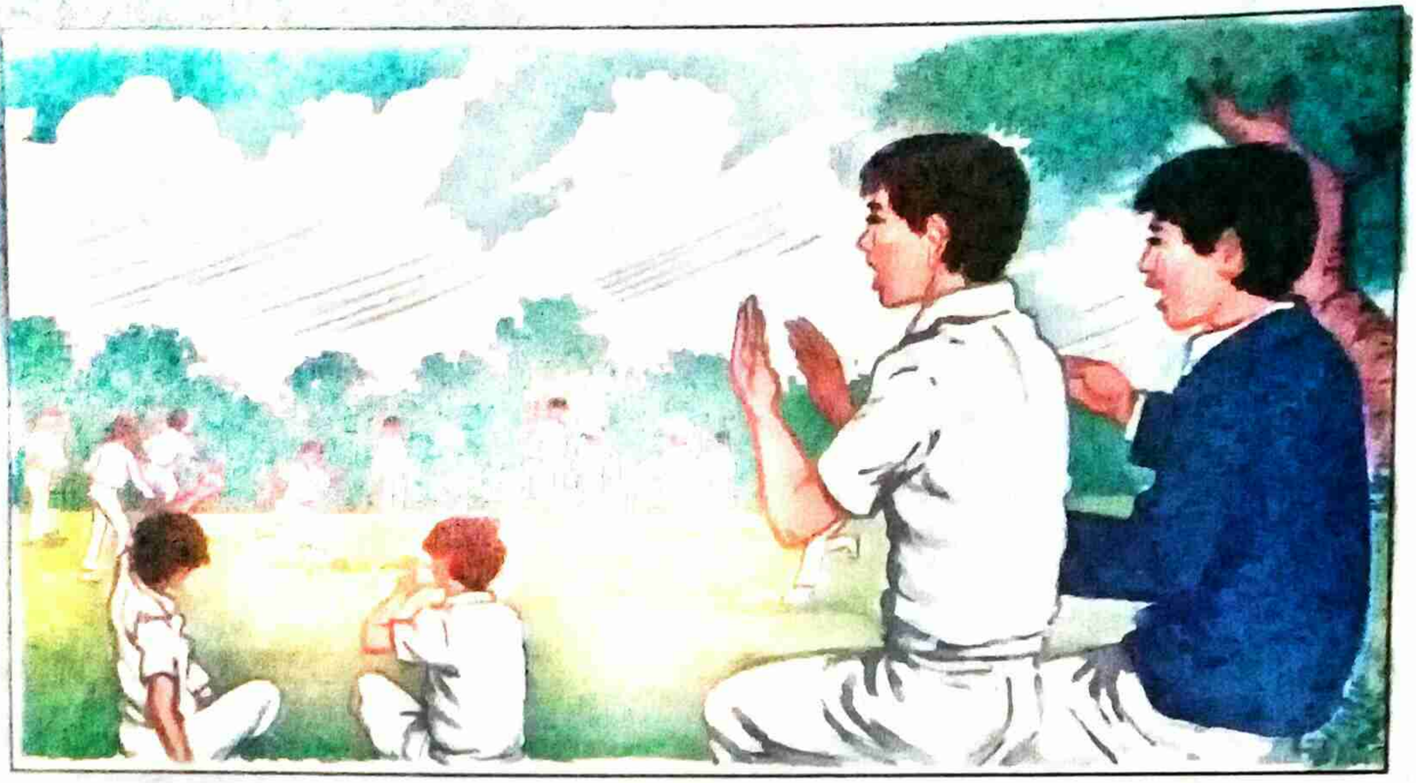

گھر تک جا پہنچی۔ یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔ جب دونوں جماعت ششم کے طالب علم تھے۔ اب دونوں جماعت ہشتم میں تھے۔ ایک سال قبل ذیشان کے پرانے مکان کی جگہ نئے مکان کی تعمیر کا آغاز ہوا تھا۔ ذیشان کے ابو نے چند سال پہلے ہی جوتے بنانے کا چھوٹا سا کام شروع کیا تھا جو ترقی کرتے ہوئے ایک فیکٹری کی شکل اختیار کر گیا۔ روپے ہاتھ میں آتے ہی مکان کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ مکان کی تعمیر کے وقت ذیشان کے گھر والے اسی گلی کے ایک گھر میں عارضی طور پر مقیم رہے۔ اتوار کے دن ذیشان کی زبانی حارث کو نئے مکان کے متعلق معلومات مل جاتی تھیں۔ مکان کی تعمیر میں عمدہ میٹریل کا استعمال کیا گیا تھا۔ تین منزلہ مکان جب مکمل ہوا تو جو بھی اس کو دیکھتا' دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اس بستی میں اس گھر سے اونچا اور خوبصورت کوئی دوسرا گھر نہ تھا۔ نئے مکان کی تعمیر مکمل ہونے پر ذیشان کے ہاں ایک پر تکلف دعوت کا انتظام کیا گیا تھا یہی وہ موقع تھا جب حارث نے پہلی بار یہ عمدہ گھر اندر سے دیکھا۔ اس کی نظریں جگمگاتی چیزوں سے ہٹتی نہ تھیں۔ گھر کی ہر چیز شاندار تھی۔ اس دعوت کے بعد وہ اپنے گھر واپس آیا تو یہاں کی ہر چیز اس کو کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ اگلی صبح اس کے ابا جان تو پھل منڈی چلے گئے۔ مگر وہ اپنی امی کے سامنے سوالیہ نشان بنا کھڑا تھا: "ابو سے کہیں وہ بھی ذیشان کے گھر جیسا خوبصورت گھر بنائیں"۔

"یہ گھر بھی خوبصورت ہے بیٹا"۔ اس کی امی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہمارا گھر خوبصورت نہیں ہے" حارث نے امی جان کی بات پوری بھی نہ ہونے دی۔

"تمہیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے سر چھپانے کی جگہ تو دے رکھی ہے۔ وہ لوگ بھی تو ہیں جو بغیر گھر کے جھونپڑیوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ہم بھی ایک دن اس گھر کو نئے سرے سے تعمیر کریں گے"۔ امی جان کی بات سن کر حارث خاموشی سے گھر کے ٹوٹے پھوٹے فرش کو گھورنے لگا۔

"ابا اور امی نے سمجھا بجھا کر حارث کو ذیشان کے گھر جانے سے روکنے کی کوشش کی مگر وہ کب باز آنے والا تھا۔ اسے جب بھی موقع ملتا وہ ذیشان کے ہاں چلا جاتا اور اداس ہو کر واپس آتا۔ وہ اس دن بھی اداس ہوا تھا جب اس کے ابو گاؤں سے اس کی خالہ کے بیٹے امین کو اپنے گھر لائے تھے۔ امین کی والدہ تو بچپن ہی میں وفات پا گئی تھیں جب کہ اس کے والد بھی چند ماہ پہلے دل کا دورہ پڑنے سے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ خاندان کے سبھی لوگ روزگار کی تلاش میں مختلف شہروں میں بکھرے ہوئے تھے۔ گاؤں میں تھوڑی سی زمین تھی جس پر کاشت کاری کر کے امین کے والد

روزگار کماتے تھے۔ باپ کا سایہ سر سے اُٹھنے کے بعد اب گاؤں میں امین کا کوئی سہارا نہ تھا۔ حارث کے ابو اسے اپنے گھر لے آئے۔ گھر میں ایک فرد کا اضافہ ہو گیا تھا۔ کمرے میں حارث کی چارپائی کے ساتھ اس کی چارپائی بچھا دی گئی۔ حارث کے سکول میں اسے چھٹی جماعت میں داخل کروا دیا گیا۔ امین کے آنے کے بعد حارث نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ ابا جان جو اس سے پہلے کبھی کبھار ہی پھل لاتے تھے اب تقریباً روزانہ پھل لانے لگے تھے۔ جتنا پھل حارث کو ملتا تھا اتنا ہی امین کے حصے میں آتا تھا۔ حارث کا نیا جوتا آتا تو امین کو بھی نیا جوتا ملتا۔ سکول جاتے ہوئے دونوں کو دو دو روپے ملتے تھے۔ رات کو سوتے وقت دونوں کو دودھ کا ایک ایک گلاس پینے کو ملتا۔ حارث کے امی ابو جس قدر امین سے پیار کرتے وہ اُسی قدر اس سے نفرت کرتا تھا۔ اس کو بلا وجہ مارتا۔ اس کی چیزیں چھین لیتا۔ ابھی پرسوں ہی امی جان پڑوس میں اور ابا جان پھل منڈی گئے ہوئے تھے کہ حارث نے امین کا پین چھین لیا۔

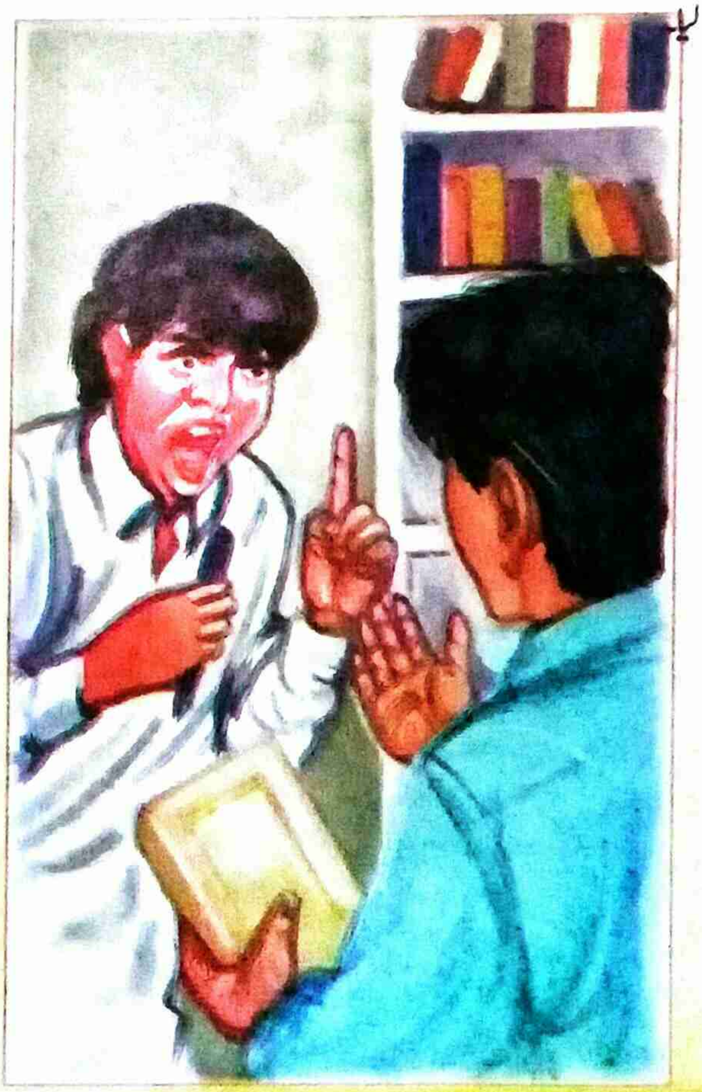

"حارث بھائی مجھے سکول کا کام کرنے دیں۔ میرا پین واپس کر دیں"۔ امین نرمی سے بولا۔

"تمہارے باپ کا ہے پین' کیوں واپس کروں؟ یہ میرے ابو لائے ہیں اس لیے یہ میرا پین ہے"۔ حارث کا لہجہ تلخی سے بھرا ہوا تھا۔

"حارث بھائی مجھے تنگ مت کریں میرا پین واپس کر دیں"۔ امین نے التجا کی۔

"نہیں کروں گا پین واپس' جاؤ کر لو جو کرنا ہے"۔ حارث غرایا۔

امین اپنا پین واپس لینے کے لیے آگے بڑھا تو حارث نے ایک مکا اس کے منہ پر جڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کو چکر سا آ گیا۔ حارث نے اسی پر بس نہ کی اس نے ایک زور دار مکا اس کی کمر میں بھی دے مارا۔ امین درد کی شدت سے رونے لگا۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ امی جان جب آئیں تو امین کی سرخ آنکھیں دیکھ کر تڑپ اٹھیں۔ انہوں نے امین کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا تو امین نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ امی جان نے حارث کو ڈانٹا اور اس سے امین کو پین لے کر دیا۔ حارث امین کو اپنے ساتھ گراؤنڈ میں بھی نہیں لے کر جاتا تھا۔ حارث جب بھی ذیشان کے ہاں جاتا امین کو تنگ کرنے کے نت نئے طریقے اپنے ساتھ لاتا۔ کبھی اس کی کوئی کتاب جان بوجھ کر کہیں چھپا دیتا اور کبھی اس کی جراب ادھر ادھر پھینک دیتا۔ امین جب بھی حارث کو حارث بھائی کہتا وہ یہی کہتا ہے کہ میں نہیں ہوں تمہارا بھائی! امین یہ سن کر خاموش ہو جاتا۔

سالانہ امتحان میں مصروف ہونے کی وجہ سے کافی دنوں تک حارث ذیشان کے گھر نہ جا سکا۔ امتحان سے فارغ ہو کر وہ ذیشان سے ملنے گیا تو ذیشان کی بجائے دس گیارہ سال کے ایک لڑکے نے دروازہ کھولا جس نے پرانے سے کپڑے پہن رکھے تھے۔

"حارث میرے کمرے میں آجاؤ" ذیشان اپنے کمرے سے جھانک رہا تھا۔

"یار! یہ کون ہے؟" حارث نے کمرے میں داخل ہوتے ہی

سوال کیا۔

"یہ ہمارا ایک رشتہ دار نادر ہے۔ کچھ ہی عرصہ پہلے اس کے والدین ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ ابا جان پچھلے ہفتے اسے گھر لائے ہیں"۔

"اچھا تو یہ ہمارے ہی گھر والا معاملہ ہے"۔ حارث بولا۔

"تمہارے گھر والا معاملہ نہیں ہے۔ تم نے تو امین کو بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے۔ میرے امی ابو تو اسے یہاں اس لیے لائے ہیں کہ گھر کا کام کاج کر دیا کرے گا اور بازار سے سودا سلف بھی لے آیا کرے گا۔ یوں ہمیں ایک طرح سے مفت میں نوکر مل گیا ہے۔ یہ دیکھو کل میرے ابو میرے لیے نئی پینٹ شرٹ لائے ہیں"۔

"کیا یہ صرف تمہارے لیے آئی ہے؟" حارث نے پوچھا۔

"ہاں یہ صرف میرے لیے آئی ہے۔ یہ ہمارا گھر ہے تمہارا گھر نہیں" ذیشان یہ کہہ ہی رہا تھا کہ نادر چائے کے کپ لیے آ گیا۔ دونوں چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ حارث اپنے گھر میں امین کو اور گلشن منزل میں ذیشان کے ساتھ مل کر نادر کو تنگ کرتا۔ وہ نادر کو کمرے میں بند کر کے باہر سے دروازہ بند کر دیتے۔ وہ بیچارا کمرے میں بند چیختا چلاتا تو دونوں قہقہے لگاتے، خوشی سے ہاتھ پر ہاتھ مارتے پھر خود ہی دروازہ کھول دیتے۔ اتنی دیر میں نادر کا رو رو کر برا حال ہو جاتا۔

سالانہ امتحان پاس کرنے کے بعد حارث جماعت نہم اور امین جماعت ہفتم میں چلا گیا تھا۔ نئے تعلیمی سال کا پہلا دن تھا۔ حارث تو سکول گیا مگر امین بخار کی وجہ سے سکول نہ جا سکا۔ تیسرے پیریڈ میں اسلامیات کے اُستاد نے سبق کے دوران ایک ایسی بات بتائی کہ حارث شرمندہ ہوتا چلا گیا۔ اس نے سکول میں بڑی بے چینی سے وقت گزارا۔ جونہی سکول میں چھٹی کی گھنٹی بجی وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چلا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو کمرے میں امی جان لحاف میں لپٹے امین کا سر دبا رہی تھیں۔ ابا جان بھی پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ حارث نے اپنا بستہ ایک طرف رکھتے ہی گھر کے ٹوٹے پھوٹے فرش کو چوما، بے رنگ دروازوں، کھڑکیوں کے ساتھ چمٹا پلستر سے بے نیاز دیواروں کی طرف بہت ہی پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ اس کے امی ابو حیران تھے کہ حارث کو کیا ہو گیا ہے۔

"پیارے امی ابو میں کتنا غلط تھا۔ ہمارا گھر ذیشان کے گھر سے بہت خوبصورت ہے۔ خوبصورت ہی نہیں دلنشین بھی ہے۔ مجھے آج ایسی بات کا پتا چلا ہے جس کا مجھے پہلے علم نہ تھا"۔

"کونسی بات بیٹا؟" امی جان کے پوچھنے پر حارث بولا:

"ہمارے اسلامیات کے اُستاد نے ایک حدیث مبارکہ سنائی ہے کہ: "مسلمانوں کے گھروں میں سب سے بہتر گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم موجود ہو اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جا رہا ہو اور بدترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا جا رہا ہو"۔ میں نے گلشن منزل میں نادر کے ساتھ ہونے والا برا سلوک بھی دیکھا ہے اور اپنے گھر میں امین کے ساتھ ہونے والا اچھا سلوک بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔ گلشن منزل ذیشان کا گھر نہیں گلشن منزل تو ہمارا گھر ہے۔ جہاں محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ میں اب کبھی بھی اپنے گھر کو برا نہیں کہوں گا۔ ہمارا گھر تو پیارا گھر ہے۔ بہت خوبصورت گھر! میں اس گھر! کو مزید خوبصورت بناؤں گا اور امین کو اپنا چھوٹا بھائی بنا کر رکھوں گا"۔

حارث کی باتوں سے امی ابو اور امین کی آنکھوں میں چمک آ گئی کیونکہ صبح کا بھولا اپنے گھر جو لوٹ آیا تھا۔ ☆☆☆

سنہری باتیں

(مراسلہ: تسلیم احمد، پشاور)

☆ خوش اخلاقی سے پیش آنا بھی ایک صدقہ ہے۔

☆ دوستوں کو نصیحت تنہائی میں اور ان کی تعریف محفل میں کرنی چاہیے۔

☆ اگر کسی کو آرام دینے کی توفیق نہیں تو تکلیف بھی نہ دو۔

☆ اپنی چوکھٹ کے سامنے جھاڑو لگایئے ساری دنیا صاف ہو جائے گی۔

سائنس فکشن

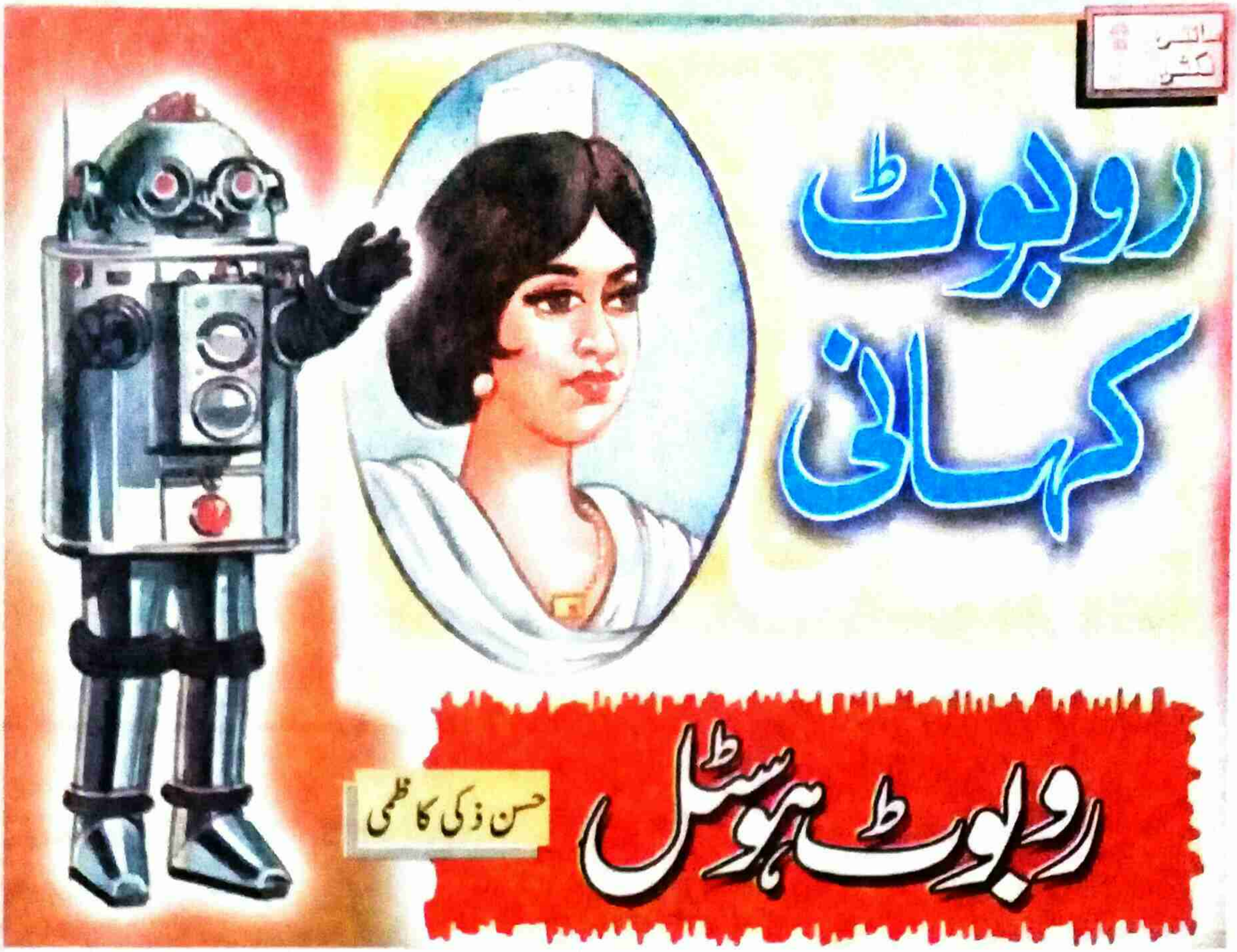

روبوٹ کہانی

روبوٹ ہوسٹل

حسن ذکی کاظمی

شہلا نے اپنا وعدہ پورا کیا اور حمزہ کو ٹیلی فون پر یہ خوش خبری سنائی کہ اس کے لیے روبوٹ ہوسٹل میں داخلے کا پاس حاصل کر لیا گیا ہے۔ حمزہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے انتظار میں گن گن کر وقت گزارا اور آخر وہ وقت آن پہنچا جب اسے شہلا کے ساتھ روبوٹ ہوسٹل جانا تھا۔ اسے بڑی بے چینی سے اس وقت کا انتظار تھا جب وہ اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھے گا جو کتابوں اور رسالوں میں پڑھتا رہتا تھا۔

حمزہ شہلا کے ہسپتال پہنچا تو وہ اپنا کام ختم کر کے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا اور کار پارک کی طرف روانہ ہوئے۔ شہلا نے ریموٹ کنٹرول سے اپنی کار کا انجن اسٹارٹ کیا تاکہ ان کے وہاں پہنچنے تک گاڑی ذرا گرم ہو جائے اور پھر ریموٹ کا بٹن دبا کر دروازوں کا تالا کھولا۔ شہلا گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی اور حمزہ کو بھی ساتھ بٹھا لیا۔ حمزہ نے حیرانی سے پوچھا:

"کیا آپ ڈرائیو نہیں کریں گی؟"

شہلا مسکرا کر بولی "نہیں، میں پیچھے بیٹھ کر اطمینان سے تم سے باتیں کروں گی اور کار خود چلے گی"۔

یہ کہہ کر اس نے ریموٹ کنٹرول ہی کے ذریعے کار کے کمپیوٹر کو اپنی منزل اور راستے کے بارے میں ہدایات دیں اور کار نے رینگنا شروع کیا۔

"ارے رے یہ کیا؟ ارے یہ تو کمپیوٹرائزڈ کار ہے۔ ہے نا؟"

حمزہ نے بڑی حیرانی سے پوچھا۔ شہلا نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"جی جناب۔ یہ ہے روبو کار یعنی روبوٹ گاڑی۔ میں نے تھوڑے ہی دن پہلے خریدی ہے...... سوچا آج آپ کو اس کی سیر کرادوں۔"

گاڑی کی رفتار تیز ہوئی تو حمزہ کچھ سہم گیا اور بولا:

"لیکن مجھے تو کچھ ڈر لگ رہا ہے۔ بغیر ڈرائیور کے کار کہیں کچھ گڑ بڑ نہ۔"

شہلا نے بات کاٹی "کچھ نہیں ہوتا۔ بالکل نہ ڈرو۔ یہ دیکھو سڑکوں پر جو برقی سنسر لگے ہیں وہ کار کے کمپیوٹر کے ساتھ مل کر کار کو کنٹرول کرتے ہیں تاکہ کاریں ایک دوسرے سے ٹکرانے نہ پائیں۔ ان کی رفتار ٹریفک کے مطابق کم زیادہ ہوتی ہے اور وہ اپنے راستے پر صحیح طریقے سے مڑتی رہیں۔ کار اسی نقشے کے مطابق اپنا سفر طے کرے گی جو اس کے کمپیوٹر میں فیڈ کر دیا گیا ہے"۔

حمزہ کی حیرانی تو کم نہ ہوئی لیکن اس کے چہرے سے خوف کے آثار ختم ہو گئے۔ اس نے سیٹ کے پچھلے حصے سے کمر لگائی اور ذرا اطمینان سے بولا:

"ہاں...... پڑھا تو میں نے بھی ہے روبو کار کے بارے میں۔ آج اس میں بیٹھ بھی لیا...... اور ہاں وہ شہلا اوہ! کیا کہوں آپ کو...... شہلا باجی...... شہلا آپا یا پھر سسٹر شہلا...... چلئے ابھی تو سسٹر کہہ لیتا ہوں۔ ہاں تو سسٹر آپ نے کہا تھا کہ آپ مجھے اس مریض کے بارے میں بتائیں گی جو ہر وقت وارڈ میں ٹہلتا رہتا تھا...... ٹہلتا بھی نہیں بلکہ مارچ کرتا رہتا تھا۔ ہاں تو بتایئے وہ کون تھا؟"

شہلا نے جواب دیا "بھئی یہ لمبی کہانی ہے اور روبوٹ ہوسٹل اب زیادہ دور نہیں۔ اس شخص کے بارے میں بتاؤں گی ضرور لیکن پھر کسی وقت۔ اس وقت تو جلدی جلدی تمھیں یہ بتا دوں کہ 1997ء میں جاپان کی ہونڈا کمپنی نے پانچ فٹ تین انچ لمبا ایک انسانی روبوٹ تیار کیا۔ یہ روبوٹ دیکھ سکتا تھا' اپنا سر موڑ سکتا تھا خود مڑ سکتا تھا' رکاوٹیں پار کر سکتا تھا اور اگر اُسے دھکا دیا جاتا تو وہ سنبھل جاتا یعنی اپنے جسم کا توازن ٹھیک کر لیتا۔ اس روبوٹ کی دھوم مچ گئی تھی"۔

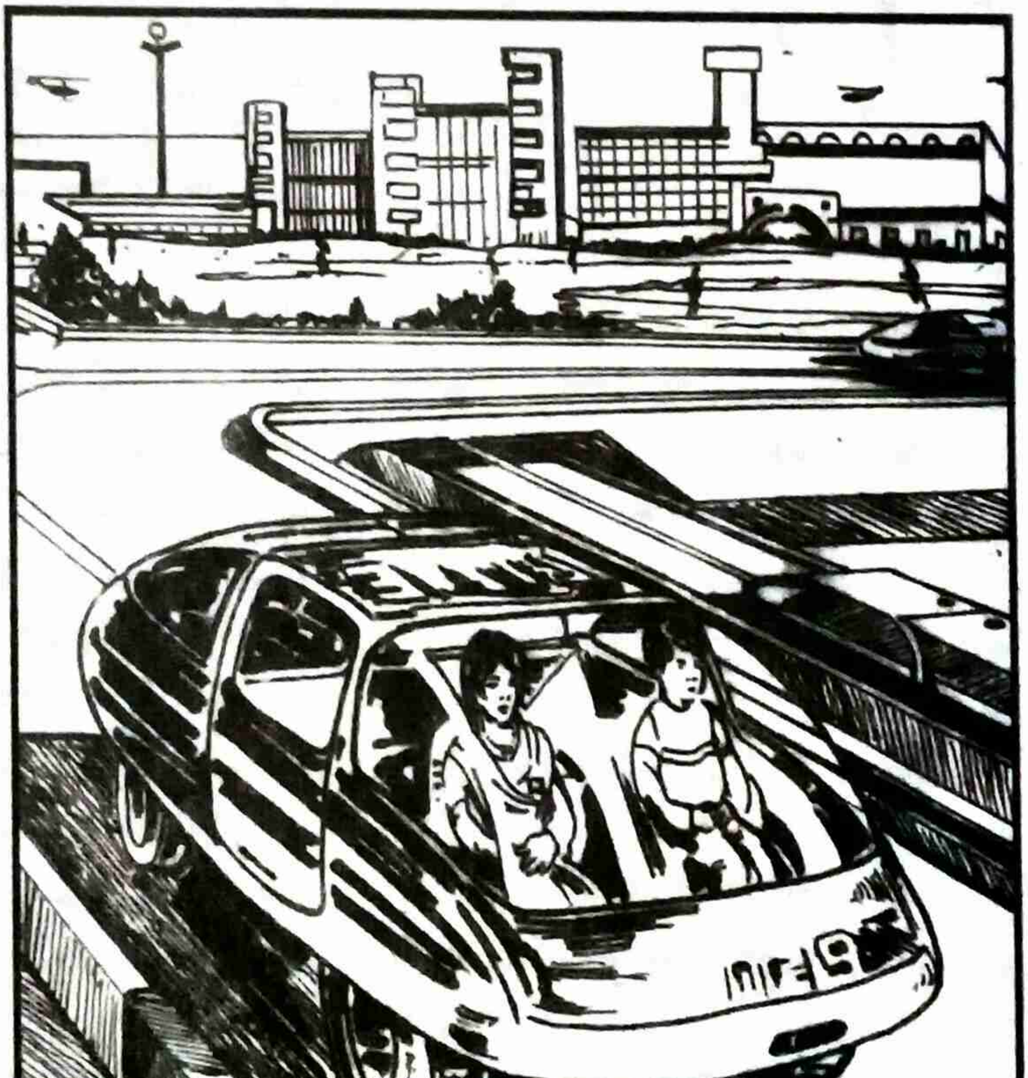

حمزہ اس سے زیادہ صبر نہ کر سکا کہنے لگا:

"سسٹر! یہ سب باتیں میں پڑھ چکا ہوں...... پتا نہیں آپ اس آدمی کے بارے میں کیوں نہیں بتاتیں"۔

شہلا نے سوال کیا "تو مطلب یہ ہوا کہ تم صرف انسانوں کے بارے میں دل چسپی رکھتے ہو اور روبوٹس سے تمھیں کوئی دل چسپی نہیں۔ پھر روبوٹس ہوسٹل جانے کا اتنا شوق کیوں تھا؟"

حمزہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ جلدی سے بولا:

"نہیں نہیں...... ایسی بات نہیں۔ مجھے تو روبوٹس سے بہت دل چسپی ہے اور آپ سے ملنے کے بعد تو روبوٹس سے محبت ہو گئی ہے۔ اچھا بتایئے

مجھے روبوٹس کے بارے میں اور باتیں"۔

شہلا نے بولنا شروع کیا:

"دیکھو بات یہ ہے کہ روبوٹس ہوسٹل میں تم مختلف طرح کے روبوٹس سے ملو گے۔ ان میں بعض کی شکل اور حلیہ انسانوں سے ملتا جلتا ہے لیکن بعض بالکل انسان کی طرح ہیں۔ شاید بعض روبوٹس کو دیکھ کر تم سمجھ ہی نہ سکو کہ یہ روبوٹ ہے یا انسان...... اس صدی کے شروع میں امریکا کی ریاست میساچوسٹس میں سائنس دانوں نے یہ کوشش شروع کی کہ مختلف روبوٹس میں جو خاص خاص ذہنی صلاحیت ہے ان سب کو ایک روبوٹ میں اکٹھا کیا جائے اور Cog نامی اس روبوٹ کو اس قابل بنا دیا جائے کہ یہ دیکھ سکے' چھو سکے' سن سکے' بول سکے' سوچ سکے اور محسوس کر سکے۔ کچھ سال بعد وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے اور جناب حمزہ صاحب ان سائنس دانوں کی کامیابی کا جیتا جاگتا ثبوت آپ کے سامنے ہے۔ یعنی آپ کی سسٹر شہلا۔ یہ باتیں میں نے آپ کو یوں بتائیں کہ آپ کا ہوسٹل میں رہنے والوں سے تھوڑا سا غائبانہ تعارف ہو جائے...... اور لیجئے اب ہم ہوسٹل کی عمارت میں داخل ہو رہے ہیں"۔

حمزہ چونک پڑا اور اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گیٹ کے دربانوں سے لے کر باغ کے مالیوں اور ادھر ادھر چلتے ہوئے لوگوں کو دیکھنا شروع کیا۔ کون اصلی تھا کون نقلی؟ کون انسان تھا کون روبوٹ؟ حمزہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ گاڑی کار پارک میں پہنچ کر کھڑی ہو گئی اور شہلا اور حمزہ نے گاڑی سے اتر کر ہوسٹل کی عمارت کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ دونوں عمارت میں داخل ہونے لگے تو دروازے کے پاس کھڑے ہوئے شخص نے مسکرا کر بڑے ادب سے سر جھکایا اور بولا:

"سسٹر شہلا خوش آمدید" پھر اس نے غور سے حمزہ کو دیکھنے کے بعد اپنا سر کچھ اور جھکا دیا اور بڑی نرمی سے بولا:

"میں روبوٹ ہوسٹل میں اپنے معزز مہمانوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اپنی طرف سے بھی اور اپنے سب ساتھیوں اور دوستوں کی طرف سے بھی۔ آپ کے آنے سے ہمیں بے حد خوشی ہوئی۔ استقبالیہ کمرے میں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ تشریف لائیے"۔

یہ کہہ کر وہ استقبالیہ کمرے کی طرف چلا اور ان دونوں کو ادب سے اشارہ کیا کہ وہ پیچھے پیچھے آئیں۔ لیکن شہلا نے اُسے ٹوکا:

"ارے اتنی جلدی کیا ہے؟ ہم تو چند منٹ پہلے پہنچ گئے ہیں۔ ٹھہرو پہلے میں تمہارا تعارف تو کرا دوں...... حمزہ یہ اسیمو روبوٹ ہیں۔ بیس سال پہلے جاپان کی ہونڈا موٹر کمپنی نے ان کا پہلا ماڈل تیار کر کے اس کا نام ASIMO رکھا۔ مراد یہ تھی کہ ایجاد کے اس میدان میں یہ بہت بڑا یا اہم قدم ہے۔ پھر اسکے نئے نئے اور ترقی یافتہ ماڈل آتے رہے اور اب بالکل نیا ماڈل تمہارے سامنے ہے۔ ASIMO نہ صرف انسان کے اشاروں کو اور اس کی حرکات کو خوب سمجھتا ہے بلکہ ان پر اپنا ردعمل بھی بڑے سلیقے سے ظاہر کر سکتا ہے۔ یہ لوگوں کا استقبال کر سکتا ہے' ان سے باتیں کر سکتا ہے' ان کے چہرے پہچان سکتا ہے اور ان کی رہنمائی کر سکتا ہے اور ہمارے یہ اسیمو جن کا نام ہم سب نے "میزبان" رکھا ہے چونکہ جاپان میں پیدا ہوئے لہٰذا بے حد تمیز دار ہیں۔ حمزہ تم نے دیکھا کہ یہ کس طرح جھک جھک کر تمہیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ بالکل جاپانی انداز میں"۔

حمزہ نے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے میزبان کی طرف دیکھا تو وہ کچھ اور جھک گیا اور مسکرا کر دونوں کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ یہ لوگ استقبالیہ کمرے میں پہنچے تو وہاں بڑی رونق تھی۔ حمزہ نے جلدی سے شہلا کے کان میں کہا "سسٹر کیا یہ سب روبوٹ ہیں؟" اور شہلا نے مسکرا کر اتنی ہی جلدی سے جواب دیا "پہچانو تو جانیں"۔

روبوٹ ہوسٹل میں حمزہ کافی دیر تک ٹھہرا رہا۔ اس نے ہوسٹل کی عمارت اور ان سہولتوں کا بڑے غور سے جائزہ لیا جو روبوٹس کے لیے ہوسٹل میں فراہم کی گئی تھیں۔ یوں تو حمزہ کی ملاقات ہوسٹل میں بہت سے روبوٹس سے ہوئی لیکن چند شخصیتیں ایسی تھیں جن سے وہ بے حد متاثر ہوا اور اس کا دل چاہا کہ بار بار ان سے ملے۔ ہوسٹل کی خاص خاص باتیں وہ اپنی نوٹ بک میں اس انداز سے لکھتا رہا جیسے اسے روبوٹس کے بارے میں کوئی تحقیقی مقالہ لکھنا ہو۔ ہوسٹل سے روانگی کے وقت میزبان نے انہیں رخصت کیا اور چلتے چلتے حمزہ سے سوال کیا:

"آپ نے روبوٹس کے بارے میں اتنا پڑھا ہے کہ میں

حیران رہ گیا۔ لیکن یہ بتایئے کہ میرے جیسے روبوٹس کا نام جو ایسمو رکھا گیا ہے اس میں بھی کوئی خاص بات ہے؟"

حمزہ نے مسکرا کر میزبان کی طرف دیکھا اور بولا:

"جی ہاں خاص بات تو ہے۔ ویسے تو مسز شہلا بتا چکی ہیں کہ اے' ایس' آئی' ایم اور او ایسے الفاظ کے پہلے حروف ہیں جن سے مراد ایجاد کے میدان میں بڑا قدم ہے لیکن ایسمو ایک عظیم سائنس دان اور مصنف آئزک ایسمو کے نام سے بھی ملتا جلتا ہے جس نے بے شمار سائنسی ناول اور کہانیاں لکھی ہیں۔ ایسمو پیدا تو روس میں ہوا لیکن پھر اپنے والدین کے ساتھ امریکا آگیا۔ وہ 1920ء میں پیدا ہوا اور بہتر سال عمر پائی۔ اس نے 1939ء میں رسالوں کے لیے سائنسی کہانیاں لکھنا شروع کیں اور 1950ء میں اس کی پہلی کتاب چھپی اور پھر تو اس کی اتنی کتابیں چھپیں کہ لوگ حیران رہ گئے۔ تین سو سے بھی زیادہ۔ اس کی کہانیوں میں خاصی بڑی تعداد ایسی کہانیوں کی تھی جو روبوٹس کے بارے میں تھیں۔ 1950ء میں اس کی روبوٹ کہانیوں کا مشہور مجموعہ شائع ہوا جس میں اس نے کئی دلچسپ فرضی قانون بھی بنائے جن کا تعلق انسان اور روبوٹس کے آپس کے تعلقات سے ہے۔ اس لیے ایسمو کو روبوٹس کی دنیا میں خاص شہرت حاصل ہے اور اسی وجہ سے غالباً آپ کی برادری کے روبوٹس کا نام ایسمو رکھا گیا ہے"۔

میزبان حیرت سے چلایا "ارے حمزہ آپ تو روبوٹس کا انسائیکلو پیڈیا ہیں" اور پھر اس نے ادب سے اپنا سر حمزہ کے سامنے جھکایا۔ حمزہ میزبان سے جلد ہی دوسری ملاقات کا وعدہ کر کے شہلا کے ساتھ عمارت سے باہر نکل آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ اس کی زندگی کا کتنا اہم دن ہے۔ اس کی کیسے کیسے نئے روبوٹس سے ملاقات ہوئی اور ان کے بارے میں کتنی باتیں معلوم ہوئیں۔ اس نے سوچا کہ اب وہ ماموں کو روبوٹس کے بارے میں نئی نئی باتیں بتا کر ان پر خوب رعب جمائے گا اپنی قابلیت کا اور اسے یقین تھا ماموں بہت خوش ہوں گے۔ راستے میں وہ شہلا کی طرف مڑا اور پوچھنے لگا:

"مسز! کیا میں کبھی پھر روبوٹس ہوٹل جا سکتا ہوں؟"

شہلا نے فوراً جواب دیا "کیوں نہیں میں چند روز میں تمہارا مستقل پاس بنوا دوں گی۔ پھر تم جب چاہو جا سکتے ہو۔ میرے بغیر بھی"۔

حمزہ نے کچھ سوچا اور پھر مسکرا کر بولا:

"لیکن یہ پاس بنوانے والا وعدہ بھی ویسا وعدہ تو نہیں جیسا اس مریض کے بارے میں کیا تھا جو ٹہلتا رہتا تھا"۔

شہلا ہنس پڑی اور کہنے لگی حمزے وہ مریض تمہیں پھر یاد آگیا؟ میرا خیال ہے تم معلوم کر کے ہی رہو گے کہ وہ مریض کون تھا یا کون ہے؟"

حمزہ جلدی سے بیچ میں بول پڑا:

"اور میرا خیال ہے کہ آپ مجھے ٹالتی ہی رہیں گی"۔

شہلا نے ذرا سنجیدگی سے کہا:

"نہیں حمزہ۔ بات ٹالنے کی نہیں...... بات دراصل یہ ہے کہ وہ شخص یعنی مسٹر میسن ایک عجیب مرض میں مبتلا ہے جس کی ابھی تک تصدیق نہیں ہوئی اور جب تک پکی بات معلوم نہ ہو اس وقت تک اپنی طرف سے کوئی بات کہنا میرے خیال میں مناسب نہیں تھا۔ اب چونکہ اس کے مریض ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور وہ خود بھی اپنے مرض کو چھپانا نہیں چاہتا لہٰذا تمہیں بتانے میں بھی کوئی حرج نہیں"۔

"ہاں ہاں تو پھر بتایئے نا۔ سسٹر آپ بھی بڑی لمبی بات کرتی ہیں"۔

شہلا نے مسکرا کر حمزہ کو دیکھا اور کچھ سوچنے لگی۔ پھر اس نے بولنا شروع کیا:

"دراصل مسٹر میسن ایک نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہے جو بہت ہی کم...... بہت ہی کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ یہ بیماری متعدد شخصیتوں کی بیماری کہلاتی ہے۔ اس بیماری کا مریض اپنی شخصیت تھوڑی تھوڑی دیر یا تھوڑے تھوڑے عرصے میں بدلتا رہتا ہے۔ یوں سمجھو کہ ابھی وہ اپنی اصل شخصیت میں ہے۔ مثلاً ایک وکیل ہے وہ بالکل درست باتیں کر رہا ہے' صحیح طریقے سے اپنے کام کر رہا ہے اور ایک نارمل انسان ہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک استاد بن گیا اور پھر اس نے ساری وہ باتیں شروع کر دیں جو ایک استاد کرتا ہے۔ مثال کے طور پر فرضی کلاس میں لیکچر دینے لگا اپنے شاگردوں کو ہدایات دینے لگا یا خود ہی خود فرضی کالج کے اسٹاف روم میں دوسرے استادوں سے باتیں کرنے لگا۔ کبھی وہ پانچ چھ سال کا بچہ بن جاتا ہے۔ کہانیوں کی کتابیں پڑھنے لگتا ہے' بچوں کی طرح ضدیں کرتا ہے' کھیل کود شروع کر دیتا ہے' ڈرتا ہے۔ کبھی وہ فوجی بن کر پیریڈ شروع کر دیتا ہے' یوں ظاہر کرتا ہے جیسے جنگ کے میدان میں ہے' باقاعدہ کمانڈ کرتا ہے اور پھر واپس اپنی اصل شخصیت میں آجاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ ایک ٹیلی ویژن سیٹ ہے جس کے چینل بدل رہے ہیں۔ کوئی مریض دو تین شخصیتیں بدلتا ہے اور کوئی اس سے بھی زیادہ ہر شخصیت کا اپنا نام ہوتا ہے' اپنی تاریخ ہوتی ہے' اپنی کہانی ہوتی ہے۔ اس شخصیت کی عمر کچھ بھی ہو سکتی ہے اور وہ مرد سے عورت اور عورت سے مرد بھی بن سکتا ہے"۔

حمزہ نے بڑے غور سے شہلا کی بات سنتے سنتے اچانک اس کی بات کاٹ کر کہا:

"اچھا تو مسٹر میسن ایم پی ڈی کے مریض ہیں"۔

شہلا نے حیران ہو کر کہا "ہاں تو تم اس بیماری کے بارے میں پہلے سے جانتے ہو جبھی تو تمہیں اس کا یہ مختصر نام معلوم ہے"۔

حمزہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا "بہت تھوڑا سا یوں سمجھ لیجئے کہ بس نام ہی سنا ہے"۔

شہلا بولی "تم تو پورے بقراط ہو۔ یہ بتاؤ کہ کیا ہر وقت پڑھتے ہی رہتے ہو؟"

حمزہ زور سے ہنسا اور کہنے لگا "پڑھتا بھی ہوں' سنتا بھی ہوں اور سمجھنے کی بھی کوشش کرتا ہوں لیکن بقراط بننے میں ابھی بڑا عرصہ لگے گا"۔

شہلا حیرانی سے حمزہ کا چہرہ دیکھ رہی تھی کہ کار چلتے چلتے رک گئی۔ حمزہ کا گھر آچکا تھا۔ اس نے پیار سے حمزہ کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا:

"اچھا جلدی ہی ملیں گے اور پھر میں ایم پی ڈی کے بارے میں اور باتیں بتاؤں گی۔ ٹھیک ہے؟"

کار سے اترتے ہوئے حمزہ نے جواب دیا "ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن آپ نے مسٹر میسن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ وہ کیسے اور کیوں اس بیماری میں مبتلا ہوئے؟ اور وہ کون ہیں" شہلا نے ہاتھ ہلاتے ہوئے بس اتنا کہا "سب کچھ آئندہ ملاقات میں" اور کار روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

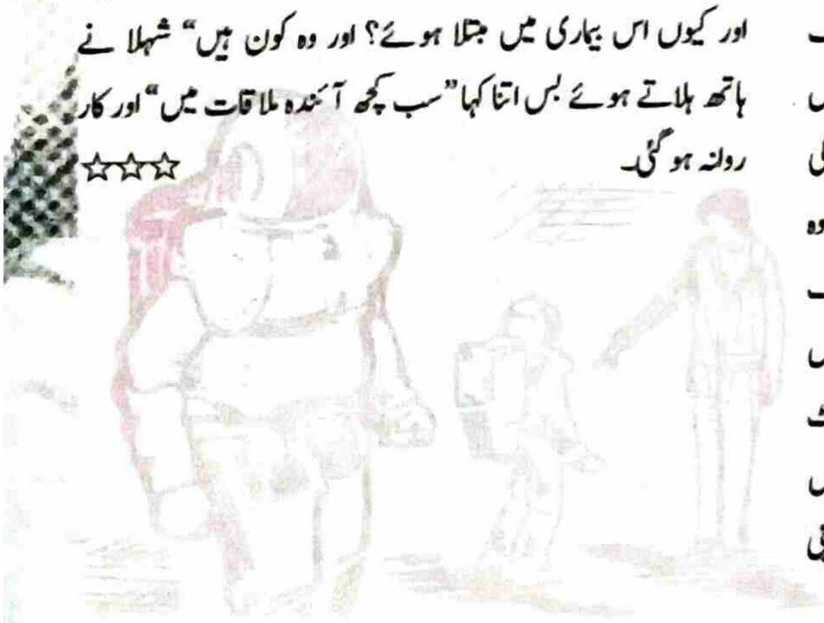

راستہ

محمد شعیب مرزا

"امی جان! مجھے پانچ روپے دیں"۔

"ابھی صبح ہی تو سکول جاتے ہوئے تم نے پانچ روپے لیے تھے۔ اب کیا کرنے ہیں؟" سرمد کے مطالبے پر امی جان نے حیران ہو کر پوچھا۔

"چپس کی ایک کمپنی والوں نے انعامی سکیم شروع کی ہے۔ میں نے وہ چپس لینی ہے۔ میرے کئی دوستوں کے انعامات نکلے ہیں۔ ضرور میرا بھی کوئی انعام نکل آئے گا"۔ سرمد نے تفصیل بتائی۔

"صبح سکول جاتے ہوئے جو پانچ روپے لے گئے تھے ان سے چپس خرید لینی تھی"۔ امی جان نے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔

"میں نے تفریح کے وقت چاکلیٹ کھا لی تھی۔ بعد میں میرے دوستوں نے چپس خریدی تو ان میں سے کچھ کے مختلف انعام نکل آئے۔ انور کی تو کمپیوٹر گیم نکلی ہے۔ آپ کو پتا ہے' میں کتنے عرصے سے ابو کو کمپیوٹر گیم لانے کے لیے کہہ رہا ہوں لیکن ابو ہمیشہ ٹال دیتے ہیں۔ آپ پانچ روپے دے دیں شائد میری کمپیوٹر گیم ہی نکل آئے"۔

سرمد کے اصرار پر امی جان برہم ہوگئیں۔ "میں جیب خرچ سے زیادہ پیسے دے کر تمہاری عادتیں نہیں بگاڑنا چاہتی۔ اب تمہیں صبح سکول جاتے ہوئے ہی پیسے ملیں گے ان سے جو مرضی خریدنا"۔ یہ کہہ کر امی جان کچن میں چلی گئیں۔

سرمد کے سر پر کمپیوٹر گیم سوار تھی۔ اُس کو تو جیسے یقین تھا کہ وہ چپس خریدے گا اور اس کا کمپیوٹر گیم کا انعام نکل آئے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسکی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اور صبح تک انتظار کرنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

آخر کار سرمد نے ایک فیصلہ کیا اور اٹھ کر پہلے کچن میں جھانکا۔ امی جان رات کا کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔ وہ چپکے سے بیڈ روم میں گیا۔ تکیہ اٹھا کر دیکھا تو حسب توقع امی جان کا پرس تکیے کے نیچے موجود تھا۔ اس کے دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے اُس نے ایسی حرکت کبھی نہیں کی تھی۔ اُس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر پرس اٹھایا اور اس میں سے پیسے نکالنے لگا۔

ابھی وہ پرس میں سے پیسے نکال ہی رہا تھا کہ ایک دم نوشی کمرے میں آگئی۔ نوشی اس کی چھوٹی بہن تھی۔ نوشی کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ اس سے پہلے کہ نوشی امی جان کو جا کر بتاتی۔ سرمد نے خود کو سنبھالا اور جلدی سے پرس میں سے دس روپے نکال کر پرس تکیے کے نیچے رکھا اور نوشی کے پاس پہنچ گیا۔

"نوشی! تمہیں چپس بہت پسند ہے ناں۔ ہم دو پیکٹ چپس لیں گے ایک تم کھانا ایک میں کھاؤں گا"۔

"لیکن میں چوری کے پیسوں کی چپس نہیں کھاؤں گی"۔ نوشی سرمد کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"میری پوری بات تو سنو۔ چپس کی کمپنی والوں نے انعامی سکیم شروع کی ہے۔ اس میں بہت سے انعامات ہیں۔ آج میرے دوست انور کی کمپیوٹر گیم نکلی ہے۔ نقد پیسے بھی نکلتے ہیں۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہمارا کمپیوٹر گیم کا انعام نکل آئے گا۔ پھر ہم دونوں اس سے کھیلا کریں گے"۔ سرمد نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

کمپیوٹر گیم کا سن کر نوشی کا دل بھی للچانے لگا لیکن پھر کچھ سوچ کر سنجیدگی سے بولی۔ "اگر ہمارا کمپیوٹر گیم کا انعام نکل آیا تو ہم کمپیوٹر گیم کے بارے میں گھر میں کیا بتائیں گے؟"

"ارے پگلی! چپس میں کمپیوٹر گیم تھوڑا ہی نکلے گی اس کا کوپن نکلے گا۔ کل ہم سکول سے آتے ہوئے کمپیوٹر گیم لے آئیں گے اور گھر میں یہی بتائیں گے کہ جیب خرچ سے ہم نے چپس خریدی تھی اور انعام نکل آیا"۔ سرمد نے اُسے مزید سمجھایا۔

"اور اگر امی جان کو پیسوں کا پتا چل گیا تو؟" نوشی نے پھر ایک سوال داغ دیا۔

"اول تو ایسا ہوگا نہیں کیونکہ امی جان کے پرس میں دس دس کے کئی نوٹ تھے۔ دوسرا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمارے چپس کے کسی پیکٹ میں سے دس روپے کا انعام نکل آئے۔ وہ دس روپے لا کر ہم امی جان کے پرس میں رکھ دیں گے۔ لہٰذا اب خواہ مخواہ باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ شام ہونے کو ہے۔ ابو کے آنے سے پہلے پہلے ہمیں واپس آ جانا چاہیے"۔ اتنا کہہ کر سرمد نے نوشی کا ہاتھ پکڑا اور دونوں بہن بھائی چپکے سے باہر نکل گئے۔

دکان گھر سے ذرا فاصلے پر تھی۔ گھر کا سودا سلف ابو ہی لاتے تھے۔ البتہ کبھی کسی مجبوری کے تحت سرمد کو کوئی چیز لانے بھیج دیا جاتا تھا۔ دکان پر پہنچ کر انہوں نے چپس کے پیکٹ خریدے اور بڑی بے تابی سے انہیں کھولنے لگے۔ اس وقت انہیں سخت مایوسی ہوئی جب ایک پیکٹ میں سے سیٹی اور دوسری میں سے دو روپے کا نوٹ نکلا۔ سرمد نے جب نوشی کو پریشان دیکھا تو اُسے کہنے لگا "چلو اب چپس تو کھاؤ۔ چپس کا مزا تو کرکرا نہ کرو"۔ نوشی اُس کی بات سن کر مسکرا دی اور وہ چپس کھاتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

چلتے چلتے انہیں محسوس ہوا کہ وہ کسی غلط راستے پر آ گئے ہیں۔ سرمد نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا لیکن اسے راستے کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ اس دکان سے سودا لے کر گیا تھا لیکن کبھی راستہ نہیں بھولا تھا لیکن آج نہ جانے وہ کدھر نکل آیا تھا۔ وہ نوشی کا ہاتھ تھام کر ایک طرف کو چلنے لگا۔

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا لیکن ابھی تک انہیں گھر کا راستہ نہیں ملا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ انہیں کوئی راہ گیر بھی نظر نہیں آ رہا تھا جس سے وہ راستہ پوچھ سکیں۔ وہ دونوں سوچ رہے تھے کہ اب تک ابو بھی آ چکے ہوں گے اور دونوں کو غائب پا کر امی اور ابو پریشان ہو رہے ہوں گے۔

نوشی نے تو اب باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔ سرمد اُسے دلاسہ دے رہا تھا لیکن اس کی اپنی پریشانی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اندھیرا ہر طرف پھیل چکا تھا۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس طرف جائیں۔ نوشی کو چپ کراتے کراتے خود سرمد نے بھی رونا شروع کر دیا تھا۔

اتنے میں انہیں سامنے سے ایک نورانی چہرے والے بزرگ آتے دکھائی دیئے۔ قریب آ کر انہوں نے پیار سے بچوں سے رونے کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں گھر کا راستہ نہیں مل رہا۔

وہ بزرگ ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگے۔ "جو بچے اللہ تعالیٰ' اس کے رسول ﷺ اور والدین کی نافرمانی کرتے ہیں اور چوری کرتے ہیں وہ راستے سے بھٹک جاتے ہیں۔ انہیں اپنی منزل کا راستہ نہیں ملتا اور وہ اندھیروں میں کھو جاتے ہیں۔"

بچوں نے سچے دل سے توبہ کی کہ وہ آئندہ کبھی چوری نہیں کریں گے۔ بزرگ انہیں اپنے ساتھ لے کر چل پڑے۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ ان کی گلی آ گئی۔ انہیں اپنا گھر بھی نظر آ گیا۔ ان کے چہرے کھل اٹھے۔

انہوں نے ادھر ادھر دیکھا لیکن بزرگ نظر نہ آئے۔ وہ غائب ہو چکے تھے۔ وہ شائد انہیں راستہ دکھانے آئے تھے۔ انہوں نے ان دونوں کو گھر کا ہی نہیں نیکی کا بھی راستہ دکھا دیا تھا۔

پھر وہ ساری عمر نیکی کے راستے پر چلتے رہے اور کبھی گم نہیں ہوئے۔

☆☆☆

"تو بچو!......" دادا جان بات کرتے کرتے کچھ سوچنے لگے پھر بولے: آپ لوگوں کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ پورے برصغیر میں مسلمانوں کی طرف سے آزادی کے لیے بھرپور جدوجہد کرنے اور اپنی قوم کو سچی رہنمائی مہیا کرنے والے سب سے بڑے لیڈر صرف اور صرف محمد علی جناح ہی تھے جن کی قائدانہ لیاقت کا اعتراف ان کے مخالف بھی کرتے تھے۔ وہ اتنے مضبوط اور شفاف کردار کے مالک تھے کہ ان پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ برصغیر کے مسلمان قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں آزادی کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دینے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ لندن میں زیر تعلیم ایک ہندوستانی مسلمان طالب علم چوہدری رحمت علی نے مسلمانوں کی متوقع آزاد مملکت کا نام بھی تجویز کر دیا تھا: پاکستان۔

اس حوالے سے ان کی یہ تجویز ہندوستانی مسلمانوں کے لیے نشان منزل ثابت ہوئی۔ بچے، بوڑھے، جوان سبھی اس منزل کو حاصل کرنے کے لیے آزادی کی جدوجہد میں شریک ہو چکے تھے۔ ایک طرف مسلمانوں کے عظیم قائد محمد علی جناح تھے اور دوسری طرف ہندوؤں کی قیادت مہاتما گاندھی کر رہے تھے۔ مہاتما گاندھی کی ہر بات ہندو ذہنیت کی نمائندہ تھی جب کہ ہمارے قائداعظم اسلام کی سربلندی اور آزاد وطن پاکستان کے حصول کے لیے حق و صداقت اور جرأت و بیباکی کی مضبوط چٹان بنے کھڑے تھے۔ دوسروں کے نزدیک تو سیاست کے معنی ہی کچھ اور تھے...... اپنے مفاد اور مطلب کی خاطر جب چاہو، اپنی بات سے مکر جاؤ۔ کہو کچھ اور کرو کچھ، وعدے کی پاسداری ضروری نہیں تھی۔ دل میں چاہے کتنا ہی بغض و کینہ کیوں نہ ہو، زبان پر رام رام کرتے رہو۔ ہندو قوم کی سوچ کا یہ انداز آج بھی ان کی تنگ نظری اور منفی ذہنیت کا ثبوت دیتا ہے جب کہ مسلمان ہمیشہ کشادہ دل اور مثبت سوچ رکھتا ہے۔ بغض، کینہ یا دشمنی اور حسد ایک مسلمان کے دل میں جگہ پا ہی نہیں سکتے۔

میرے بچو! منافقت کے اس رویے کو ہندو رہنما سیاست کا نام دیتے تھے۔ مگر ہمارے قائداعظم تو سچی اور کھری بات کہنے والے تھے' وہ نہ کسی سے ڈرتے تھے اور نہ ہی کسی کے دباؤ میں آتے تھے۔ ان کے نزدیک سچائی' دیانت اور اُصول پسندی کے ساتھ اپنے حقوق کی حفاظت کرنا ہی سیاست کہلاتا تھا۔ قائداعظم کا سچا اور کھرا کردار ہی تھا کہ جس کے سامنے دشمن کی ایک نہ چلی اور آپ کی قیادت میں آزادی کی جدوجہد نے وہ رخ اختیار کیا کہ انگریز حکومت آزادی کا مطالبہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ہمارے قائداعظم دو قومی نظریئے پر یقین رکھتے تھے اور اسی نظریئے پر ان کی سیاست اور جدوجہد کا انحصار تھا۔"

"یہ دو قومی نظریہ کیا ہوتا ہے' دادا جان!" ننھی فروہ حیران ہو کر بولی۔

"بیٹا! یہی نظریہ تو پاکستان کی اصل بنیاد ہے"۔ دادا جان وضاحت کرتے ہوئے بولے: اس دنیا میں ہمیشہ دو قسم کے لوگ موجود رہے ہیں ایک سچ بولنے والے اور سچ کا ساتھ دینے والے اور دوسرے وہ لوگ جو خود بھی جھوٹے ہوتے ہیں اور جھوٹ ہی کی طرف داری کرنے والے ہوتے ہیں۔ میری بات کو یوں سمجھو کہ کچھ لوگ اچھے ہوتے ہیں اور کچھ برے اور ان دونوں کے درمیان کبھی اتفاق نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اچھے اور نیک لوگ اچھائی کو پسند کرتے ہیں اور برے لوگ ہمیشہ برائی کی حمایت کرتے ہیں۔ بھلا ان میں کس طرح صلح ہو سکتی ہے؟ اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اچھائی اور برائی کے لحاظ سے دنیا میں ہمیشہ دو گروہ یا دو قومیں پائی جاتی ہیں۔ ایک حق اور سچ پر یقین رکھنے اور ہر قدم پر برائیوں کے خلاف جدوجہد کرنے والی اور دوسری ظالم اور ظلم کا ساتھ دینے والی۔ میرے بچو! اسی کو دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک طرف دنیا بھر کے مسلمان ہیں جو سچے دین اسلام کو ماننے والے ہیں اور دوسری طرف غلط اور منفی سوچ رکھنے والے لوگ ہیں۔

ہندو قوم مسلمانوں سے کس قدر نفرت کرتی ہے اس کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے آپ کو چھوٹا سا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ آپ خود جان جائیں گے کہ ہندو اپنی منفی سوچ کی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ کتنا بغض اور کینہ رکھتے تھے۔ ایک موقع پر طالب علموں سے ملاقات کے دوران ایک ہندو طالب علم نے قائداعظم سے سوال کیا کہ ہم میں اور مسلمانوں میں آخر کیا فرق ہے؟"

قائداعظم نے فرمایا: ٹھہرو' میں تمہیں بتاتا ہوں۔ آپ نے پانی کا ایک گلاس منگوایا اور اس میں سے ایک گھونٹ پی کر اس ہندو لڑکے سے کہا کہ باقی پانی تم پی لو۔ اس نے نہ پیا تو آپ نے ایک مسلمان طالب علم سے کہا کہ یہ پانی پی لو۔ اس مسلمان طالب علم نے گلاس پکڑا اور فوراً پانی پی لیا۔ اس پر قائداعظم نے اس ہندو نوجوان سے کہا کہ یہی فرق ہے ہندوؤں اور مسلمانوں میں!

میرے بچو! اتفاق میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ پوری مسلمان قوم اس وقت قائداعظم کی قیادت میں متحد ہو چکی تھی اور اب یہ کسی طور ممکن ہی نہیں تھا کہ مسلمانوں کو آزادی نہ دی جاتی۔ لاہور میں مینار پاکستان تو تم نے ضرور دیکھا ہو گا!"

"جی دادا جان' بہت زبردست اور عالیشان مینار ہے یہ!" بچوں نے خوشی سے اُچھلتے ہوئے کہا۔

"میرے بچو! یہ مینار تحریک آزادی اور قیام پاکستان کی علامت کے طور پر عین اُسی جگہ تعمیر کیا گیا ہے جہاں آج سے باسٹھ سال پہلے یعنی 23 مارچ 1940ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں سالانہ اجلاس میں وہ تاریخی قرار داد منظور کی گئی تھی جس میں پہلی بار مسلمانوں نے دو ٹوک الفاظ میں ایک آزاد ملک کا مطالبہ کیا تھا' اسی قرار داد کو قرار داد پاکستان کہا جاتا ہے"۔

دادا جان بات کرتے کرتے رک گئے اور دیر تک سوچتے رہے۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولے: میں بھی اس اجلاس میں شریک ہوا تھا۔ میرے ابا یعنی تمہارے پر دادا مجھے اپنے ساتھ لے کر گئے تھے۔ پورے ہندوستان سے لاکھوں مسلمان بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے۔ دوسرے شہروں سے آنے والے مہمانوں کے لیے سینکڑوں خیمے لگائے گئے تھے۔ طالب علم رہنما اور گارڈز خوبصورت وردیوں میں اپنے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ پورے میدان کو' جسے اس وقت منٹو پارک کہا جاتا تھا' سبز ہلالی پرچموں سے سجایا گیا تھا۔ اجلاس کی کارروائی جاری تھی۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد کچھ شاعروں نے آزادی کی نظمیں

پڑھیں۔ ان میں وہ مشہور نظم بھی پڑھی گئی جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح
ملت ہے جسم، جاں ہے محمد علی جناح

اس کے بعد استقبالیہ خطبہ پیش کیا گیا۔ استقبالیہ خطبہ کے بعد سیاہ اچکن پہنے ایک دبلا پتلا، دراز قد شخص نہایت پروقار انداز میں کرسی صدارت سے اٹھ کر مائیک کی طرف بڑھا تو پوری فضا زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ بچو! پتا ہے یہ شخص کون تھا؟ یہ تھے ہمارے پیارے رہنما قائداعظم محمد علی جناح"۔

"دادا جان! آپ نے قائداعظم کو دیکھا ہوا ہے؟" بچوں نے سوال کیا۔

"ہاں بیٹا! اسی اجلاس میں انہیں دیکھا تھا میں نے۔ دبلے پتلے، اونچا قد، چاق چوبند، گہری چمکتی آنکھیں، بارعب آواز، چوڑی دار پاجامہ سیاہ شیروانی پہنے، سر پر جناح کیپ۔ یہ تھے ہمارے قائداعظم! انہوں نے اپنی تقریر کے دوران واضح لفظوں میں فرمایا تھا:

ہندو اور مسلمان مختلف مذہبوں اور معاشرتی نظاموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے اور نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔ ان کا نظریہ مختلف ہے، طرز زندگی مختلف ہے۔ لفظ "قوم" کی ہر تعریف کی رو سے مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور اس لحاظ سے ان کا اپنا علیحدہ وطن، اپنا علیحدہ علاقہ اور اپنی الگ مملکت ہونی چاہیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے اپنے ہمسایوں کے ساتھ امن اور دوستی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

بچو! اس قرار داد کو متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ اس کے بعد آزادی کی جدوجہد ایک نئے دور میں داخل ہو گئی اور اقبالؒ و قائدؒ کے عظیم پاکستان کے روپ میں کامیابی کی منزل اور بھی قریب ہوتی چلی گئی"۔

اچھا بیٹا! آج کی کہانی بس اتنی ہی کافی ہے۔ بہت دیر ہو رہی ہے، چلو اب سو جاؤ۔ کل "یوم پاکستان" (23 مارچ) ہے، جلدی اٹھنا، ہم سب مل کر سرکاری تقریبات دیکھنے جائیں گے اور ...... مینارِ پاکستان بھی!" "انشاء اللہ" سارے بچے یک زبان ہو کر بولے۔

محمد علی جناح

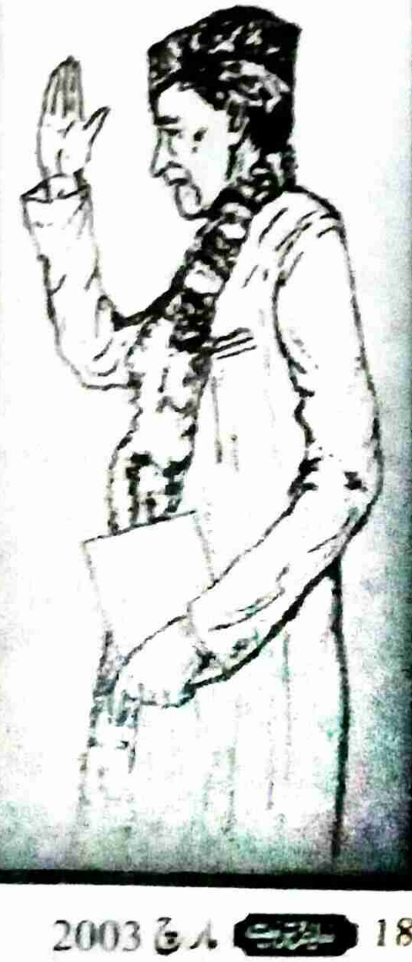

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح — ملت ہے جسم، جاں ہے محمد علی جناح
صد شکر ہے پھر گرمِ سفر اپنا کارواں — اور میر کارواں ہے محمد علی جناح
بیدار مغز ناظمِ اسلامیانِ ہند — ہے کون؟ بے گماں ہے محمد علی جناح
تصویرِ عزم، جانِ وفا، روحِ حریت — ہے کون؟ بے گماں ہے محمد علی جناح
رکھتا ہے دل میں تاب و تواں نو کروڑ کی — کہنے کو ناتواں ہے محمد علی جناح
لگتا ہے ٹھیک جا کے نشانے پہ جس کا تیر — ایسی کڑی کماں ہے محمد علی جناح
ملت ہوئی ہے زندہ پھر اس کی پکار سے — تقدیر کی اذاں ہے محمد علی جناح
غیروں کے دل بھی سینے کے اندر دہل گئے — مظلوم کی فغاں ہے محمد علی جناح
اے قوم اپنے قائداعظم کی قدر کر — اسلام کا نشاں ہے محمد علی جناح

عمر دراز پائے مسلماں کی ہے دعا
ملت کا ترجماں ہے محمد علی جناح

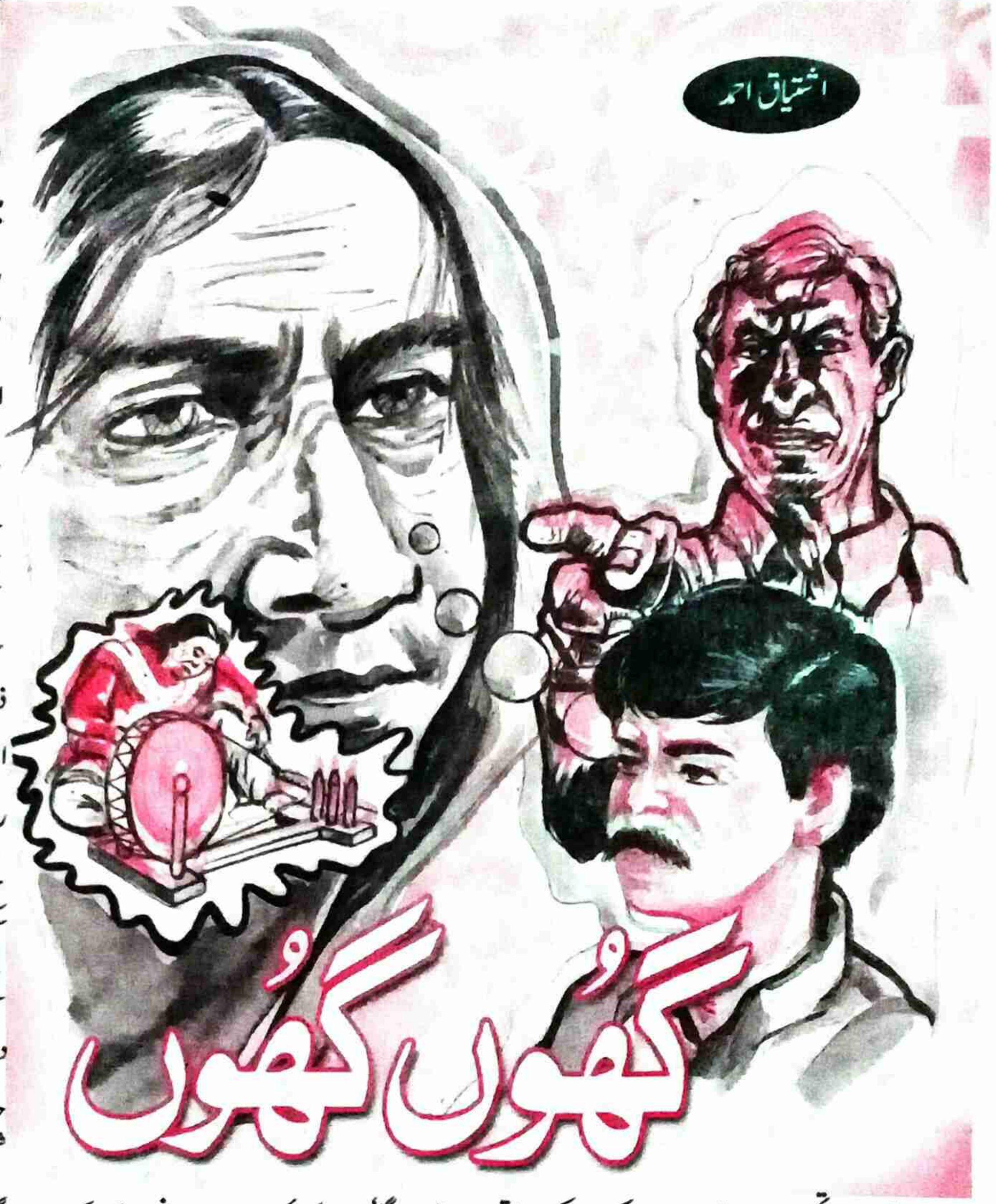

گھُوں گھُوں

اشتیاق احمد

"ناصر! تمہیں دو میں سے ایک کے ساتھ رہنا ہو گا' میرے ساتھ رہ لو یا اپنی ماں کے ساتھ' یہ نہیں ہو سکتا' میرے ساتھ بھی رہو اور اپنی ماں کی خدمت بھی کرتے رہو' ماں سے تمہیں کیا ملتا ہے' صرف خالی خولی دعائیں' ان دعاؤں سے آج تک کیا ملا ہے تمہیں! خدارا سوچو' کیا ماں کی دعائیں تمہیں نیکی کے راستے پر لے آئیں؟ کیا تم نیک بن گئے؟ حلال روزی کمائی کبھی تم نے' اچھے لوگوں کی صحبت مل گئی تمہیں؟ کیا تمہاری زندگی سکون اور اطمینان کی زندگی ہے؟ یہی دعائیں کرتی ہے نا تمہاری ماں تمہارے لیے! لیکن تمہارے اس کے پاس جانے سے میرے کاموں میں رخنہ پڑتا ہے' میں اس رخنے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں نے آج سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میرے ساتھ رہ کر کام کرنا ہے تو مکمل طور پر میرے ساتھ رہو ورنہ مستقل طور پر ماں کے پاس رہو' ماں کے پاس رہ کر فاقوں میں کھیلو' بھوکوں مرو...... اور روکھی پھیکی دعاؤں سے پیٹ بھرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں اور اگر فاقے برداشت نہیں کر سکتے...... تو ماں کو چھوڑ دو تم اس سے ملنے کے لیے بھی نہیں جا سکتے' ہاں! اس کی گزر بسر کے لیے ہر ماہ کچھ رقم ڈاک کے ذریعے بھیج سکتے ہو' اس پر میں اعتراض نہیں کروں گا۔ لیکن یہ رقم تم فرضی نام سے بھیجا کرو گے' ورنہ پولیس ہمارا سراغ لگا سکتی ہے' کیا سمجھے! تم غور کر کے' سوچ کے مجھے اپنا فیصلہ سنا دینا اور فیصلہ سنانے سے پہلے یہ جان لینا کہ ہم جیسوں کو کوئی شخص بھی ملازمت نہیں دیا کرتا' کوئی ہم پر اعتبار نہیں کیا کرتا۔ ہم اگر ایمان داری کی زندگی گزارنا چاہیں تو بھی کوئی گزارنے نہیں دیتا۔ ایک بار جب کوئی جرائم کی دنیا میں قدم رکھ دیتا ہے تو اس دنیا سے اس کی واپسی بس یوں سمجھ لو...... کہ ناممکن ہو جاتی ہے اور ادھر کیا ہے تم دیکھتے ہی ہو' پولیس دن میں دو بار آ کر ہمیں سلام کرتی ہے' پوچھتی ہے...... استاد کوئی کام ہے تو بتاؤ! کیا یہ عزت نہیں ہے' عزت اور کسے کہتے ہیں! جب تم ہمارا ساتھ چھوڑ کر اپنی ماں کے پاس چلے جاؤ گے تو یہی پولیس والے تمہیں طرح طرح سے تنگ کریں گے' ستائیں گے تمہارا جینا حرام کر دیں گے...... لہٰذا خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ اب کل اسی وقت ملاقات ہو گی"۔

یہ کہہ کر استاد اٹھ گیا اور وہ گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

دوسرے دن استاد نے اس سے پوچھا:

"ہاں! کیا فیصلہ کیا' میرے ساتھ رہنا ہے یا اپنی ماں کے ساتھ رہ کر بھوکوں مرنا ہے"۔

"میں فیصلہ کر چکا ہوں استاد! بچپن سے تمہارے ساتھ کام کر رہا ہوں' یہ تمام کام تم ہی نے مجھے سکھائے ہیں' اب میں تمہارا ساتھ بھلا کس طرح چھوڑ سکتا ہوں!...... میں تمہارے ساتھ رہوں گا' کبھی اپنی ماں کے پاس نہیں جاؤں گا' لیکن......"۔

وہ یہاں تک کہہ کر رک گیا' اس کا لیکن سن کر استاد چونکا اور تیز نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا:

"کہو! کیا کہنا چاہتے ہو؟"۔

"ایک بار...... بس آخری بار مجھے ماں سے مل آنے دو! میں اسے بتا آؤں گا کہ آخری بار تم سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ جی بھر کر مجھے دیکھ لو پھر یہ صورت تمہیں نظر نہیں آئے گی"۔

"اچھا ٹھیک ہے' جا سکتے ہو' لیکن خوب احتیاط سے کام لینا! ہو سکتا ہے پولیس تمہاری ماں کے گھر پر نظریں جمائے بیٹھی ہو"۔

"آپ فکر نہ کریں' میں رات کے وقت اپنے گھر میں پچھلی طرف سے جاؤں گا اور خاموشی سے لوٹ آؤں گا"۔ اس نے لجاتے ہوئے کہا۔

"او کے!" استاد نے خوش دلی سے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا اس نے بھی استاد کا ہاتھ گرم جوشی سے تھام لیا۔

رات کے آخری پہر اذان سے کچھ پہلے وہ اپنے گھر کے اندر داخل ہوا۔ اس نے پہلے ہی خوب اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔ لیکن پولیس والوں کا دور دور تک پتا نہ تھا۔

اس کے کانوں میں چرخہ چلنے کی گھوں گھوں سنائی دی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ ہوش سنبھالنے کے ساتھ ہی وہ اس آواز سے مانوس ہو گیا تھا۔ اس وقت اس کی دادی بھی زندہ تھی۔ دادی اور والدہ دونوں فجر سے کافی دیر پہلے اٹھ کر چرخہ کاتنا شروع کر دیتی تھیں۔ اس کی آنکھ چرخوں کی گھوں گھوں سے ہی کھلتی تھی پھر وہ بستر پر پڑا یہ آواز سنتا رہتا تھا۔

ماں نے تو اسے سکول میں داخل کرا لیا تھا لیکن نہ جانے کیسے وہ بری صحبت میں پڑ گیا اور پھر آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ اس طرح وہ ایک دن استاد کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ پرانا جرائم پیشہ تھا' اس نے اسے بھی جرائم کی دنیا کا ماہر جوان بنا دیا۔ وہ اور اس کے دوسرے ساتھی اپنے گھروں سے بالکل کٹ چکے تھے' ایک ناصر تھا جو اب تک اپنی والدہ سے ملنا جلنا ترک نہیں کر سکا تھا۔ استاد اسے بار بار روکتا رہا...... آخر آج اس نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ اسی لیے آج وہ آخری بار ماں سے ملنے کے لیے آیا تھا۔

وہ کتنی ہی دیر چرخے کی گھوں گھوں سنتا رہا' آخر قدم آگے بڑھا دیئے۔ ماں اسے دیکھ کر ٹھٹکی:

"آخر تم ہمیشہ رات کی تاریکی میں چوری چھپے کیوں آتے ہو' دن میں کیوں نہیں آتے' آتے بھی ہو تو گھڑی دو گھڑی کے لیے۔ میں پورا ایک ماہ انتظار کرتی ہوں اور تم آتے ہی چلے جاتے ہو" ماں نے اپنے پرانے جملے دہرائے۔

یہ جملے ماں ہر بار اس سے کہتی تھی اور وہ سن کر مسکرا دیا کرتا تھا۔ اس کے پاس کوئی جواب ہوتا تو دیتا۔

"آج میں تم سے آخری بار ملنے آیا ہوں ماں!"

"کیا! یہ تم نے کیا کہہ دیا میرے لال' اس طرح تو کوئی بیٹا اپنی ماں سے نہیں کہتا۔ یہ کیسی عجیب بات کہہ دی تم نے...... آخر تم کیا کام کرتے ہو؟ تم نے کبھی بتایا کیوں نہیں' چلو اب بتا دو اور یہ بھی کہ آخری بار کیوں؟"

"بس ماں! میں جس کے لیے کام کرتا ہوں اس نے شرط لگا دی ہے...... اگر اس کے لیے کام کرنا ہے...... تو ماں سے ملنا جلنا چھوڑنا ہو گا"۔

"یہ کیسی شرط ہے بیٹا' ایسی شرط تو کبھی سننے میں نہیں آئی"۔

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں ماں"

"اگر یہ کوئی مشکل بات ہے تو نہ سمجھاؤ...... لیکن تم مجھے مرنے سے پہلے زندہ درگور کیوں کر دینا چاہتے ہو' یہ تو بتا دو"۔

"مجھے افسوس ہے ماں...... میں تمہیں کچھ نہیں' کچھ بھی نہیں بتا سکتا...... جی بھر کے اپنے بیٹے کو دیکھ لو...... اب یہ صورت تمہیں پھر نظر نہیں آئے گی"۔

"ایسا نہ کہو میرے بچے' میں جب تک زندہ ہوں......

تمہیں دیکھتی رہوں گی...... تم نہیں آسکتے نہ آؤ...... لیکن میں تمہیں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں تمہیں اپنے خوابوں میں دیکھ لیا کروں گی۔ اگر تم مجبور ہو تو ٹھیک ہے۔ جاؤ بیٹا تم خوش رہو' زمانے بھر کی خوشیاں تمہیں نصیب ہوں۔ جہاں رہو خوش رہو میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی...... ہمیشہ"

یہ کہتے ہوئے بوڑھی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے خود کو ان آنسوؤں میں ڈوبتا محسوس کیا۔ ساتھ ہی ماں چرخہ چلانے لگی۔ اس نے باہر کی طرف قدم اٹھایا۔ چرخے کی گھوں گھوں اس کے کانوں میں آنے لگی۔ اس کے قدم من من بھر کے ہو گئے...... اٹھ ہی نہ سکے۔

"کیا ہوا میرے بچے رک کیوں گئے"۔

"ماں! چرخہ بند کر دو' اس کی گھوں گھوں مجھے روک رہی ہے"۔

"اچھا بیٹا! یہ لو...... میں نے چرخہ روک دیا"۔

چرغہ رک گیا گھوں گھوں رک گئی۔ اس نے قدم اٹھایا لیکن کانوں میں تو گھوں گھوں جاری تھی۔

"ماں! تم نے چرخہ نہیں روکا"۔

"روک دیا بیٹے...... یہ دیکھو ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہوں"۔

"پھر میرے کانوں میں کیوں گھوں گھوں گونج رہی ہے...... یہ مجھے آگے بڑھنے نہیں دے رہی"۔

"میں...... میں...... میں تمہارے لیے کیا کروں بیٹا...... بتا دو"۔

ماں کا چہرہ سوال بن گیا۔

"ک...... کچھ نہیں ماں...... کچھ نہیں...... میں نہیں جا سکتا...... میں نہیں جا رہا۔ یہ آواز میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ ماں اب میں تمہارے ساتھ رہوں گا...... نہیں نہیں جاؤں گا...... کبھی نہیں جاؤں گا"۔

دوسری صبح وہ مرحوم باپ کی کدال کندھے پر رکھے مزدوری کرنے جا رہا تھا۔

☆☆☆

تلاش کیجئے!

سامنے دی گئی شکل میں ایک جانور قید ہے۔ آپ نقطوں والے خانوں میں رنگ بھرتے جائیں' آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس میں کون سا جانور چھپا ہوا ہے!

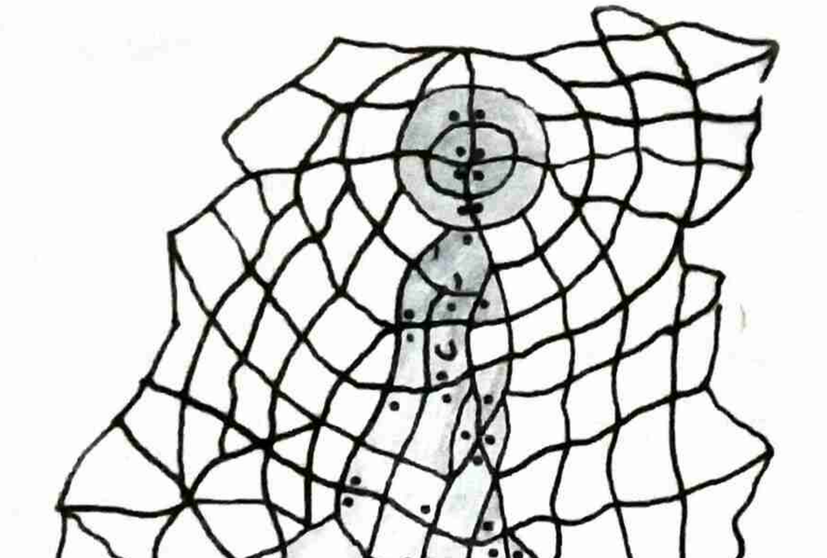

صحت کی حفاظت

سید جاوید امتیازی

”آنکھیں قدرت کا بہترین عطیہ ہیں“

رخشندہ تقریباً روزانہ ہی سر درد کی شکایت کرتی، مگر گھر میں ہر کوئی سنی ان سنی کر دیتا تھا۔ خیال تھا کہ وہ اسکول سے تھکی ہاری آتی ہے اس لیے تھکاوٹ کی وجہ سے شاید اسے سر درد محسوس ہوتی ہو۔ اظہر ماموں آئے تو امی نے ان سے اس بات کا ذکر کیا۔ اظہر ماموں چونکہ ڈاکٹر ہیں اور وہ بھی آنکھوں کے اسپیشلسٹ، لہٰذا انہوں نے فوراً ہی رخشندہ کو بلا بھیجا۔ انہیں فکر یہ تھی کہ کہیں اس کی نظر نہ کمزور ہو رہی ہو۔ ان کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ رخشندہ نے بتایا کہ اسکول میں بلیک بورڈ کی لکھائی پڑھنے میں اسے مشکل پیش آتی ہے۔ یہ تو خیر اچھا ہوا کہ اظہر ماموں آگئے اور انہوں نے جلدی سے اس کی آنکھوں کا معائنہ کر کے عینک کا نمبر دے دیا۔ مگر وہ اس بات پر پریشان بہت ہوئے۔ شام کو کلینک سے واپس آتے ہی رخشندہ کے علاوہ گھر کے سب بچوں کو اپنے پاس بٹھایا اور انہیں سمجھاتے ہوئے کہنے لگے:

”بچو! آنکھیں قدرت کا بہترین عطیہ ہیں۔ ان کے ذریعے ہم دیکھتے ہیں، رنگ رنگ کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور انہی کے ذریعے پڑھنے لکھنے کا کام کرتے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو دنیا ہمارے لیے اندھیر ہو جائے۔ ان کی اہمیت ان لوگوں سے پوچھو جو اس نعمت سے محروم ہیں۔

ہمیں اس نعمت کی قدر کرنی چاہیے۔ صبح جلدی اٹھنے کی عادت ڈالو۔ منہ ہاتھ دھوتے وقت آنکھوں میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارو۔ نماز کے لیے وضو اچھی طرح کرو۔ دیر تک سوئے رہنے سے بھی آنکھیں دکھنے لگتی ہیں۔ صبح سویرے سیر کی عادت بہت اچھی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر ننگے پاؤں چہل قدمی کرنا نظر کے لیے فائدہ مند ہے۔ گرمیوں کے دن ہوں تو سخت دھوپ سے آنکھوں کو بچاؤ، سر اور گردن ڈھانپ کر رکھو۔ تیز دھوپ میں آنکھوں پر سبز رنگدار چشمہ لگانا بھی بہت اچھا ہے۔ پڑھتے وقت کتاب کو فٹ، ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر رکھیں۔ کچھ بچے بڑے لاپرواہ ہوتے ہیں، پڑھتے وقت کتاب کو آنکھوں کے بہت قریب کر کے پڑھتے ہیں۔ یہ عادت نظر کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔

رات کو بلب یا ٹیبل لیمپ کی روشنی میں پڑھو تو خیال رکھو کہ کتاب پر روشنی صحیح طرح سے پڑ رہی ہو۔ بہت کم یا بہت تیز روشنی میں پڑھنا بھی ٹھیک نہیں۔ اور ہاں! سب سے ضروری بات میں یہ کہنا چاہوں گا کہ لیٹ کر ہرگز نہ پڑھیں۔ لیٹ کر پڑھنے سے آنکھوں پر دباؤ پڑتا ہے اور نظر کمزور ہو جاتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے رخشندہ بیٹی کی نظر کیسے کمزور ہوئی؟ اس لیے کہ یہ اکثر لیٹ کر پڑھا کرتی تھی۔ ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے میں زور دے کر کہوں گا کہ اگر کسی بچے کی یہ عادت ہے تو وہ فوراً اسے ترک کر دے۔ آپ سب لوگ اپنی آنکھوں کا خیال رکھیں۔ اچھی غذا کھائیں، ورزش کریں، سیر کریں اور میری بتائی ہوئی باتوں پر ضرور عمل کریں۔“

سُن لو پیارے بچّو!

سن لو میری بات — دن ہو کہ رات
صبح ہو یا شام — کرنا اچھے کام

کام کے بعد آرام
یہ ہے اچھا کام

بہن ہو کہ بھائی — تایا ہوں یا تائی
مالی ہو یا مائی — موچی ہو کہ نائی

سب کو کرو سلام
یہ ہے اچھا کام

وطن کے سارے بچو! — راج دلارے بچو!
چاند ستارے بچو! — سن لو پیارے بچو!

قائدؒ کا پیغام
کام، کام، کام

محمد اسحاق جلالپوری

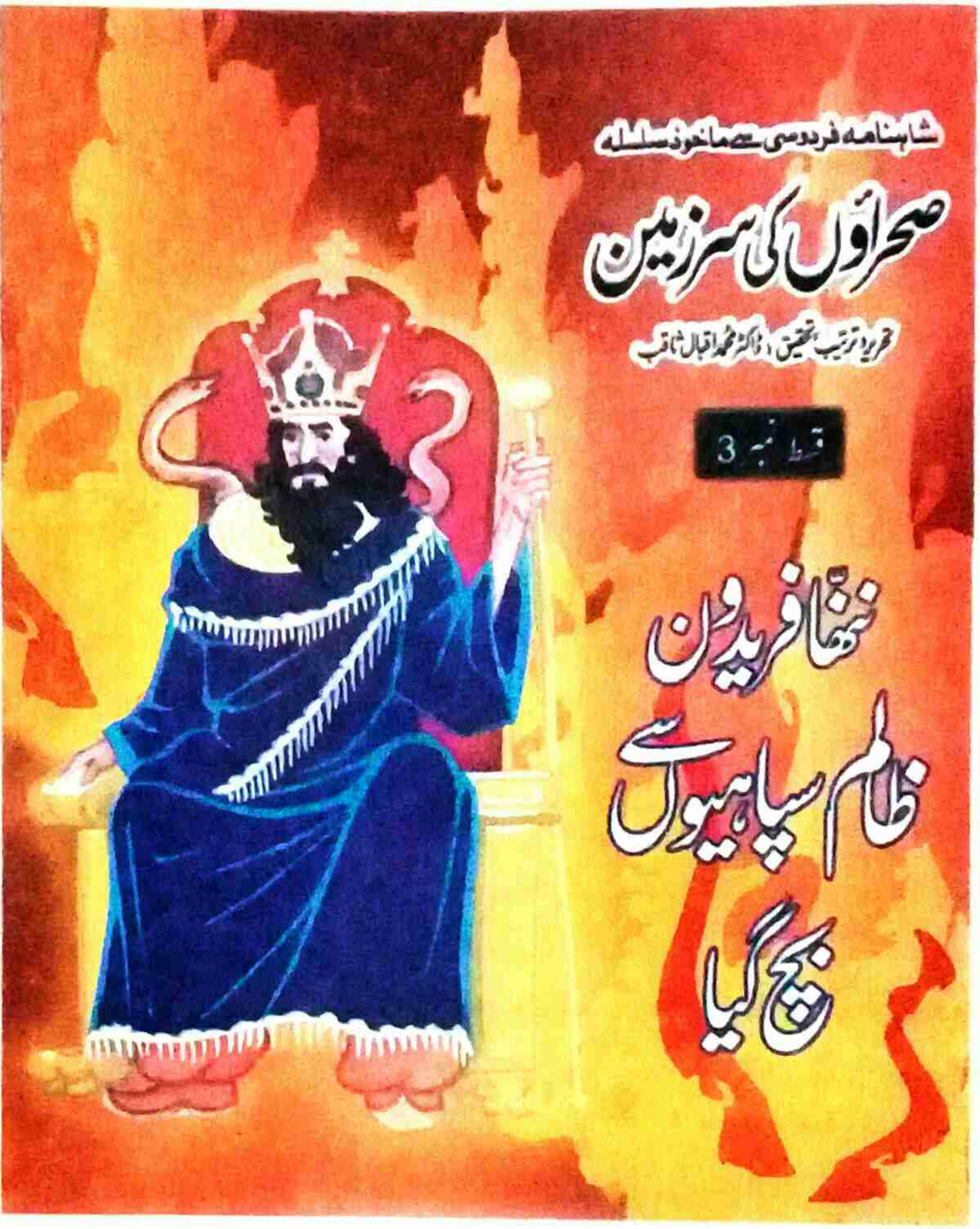

ضحاک نے جب سے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک جوان پہلوان نے گرز کے ساتھ اس پر حملہ کیا ہے اور اسے گرا دیا ہے' وہ بہت پریشان تھا۔ بلکہ عاملوں اور نجومیوں نے جب اسے اس خواب کی تعبیر بتائی کہ ایک "فریدون" نامی نوجوان تجھے تخت و تاج سے محروم کر دے گا اور ایک گرز کے ساتھ حملہ کر کے تمہاری جان لے لے گا' خوف اور ہراس سے اس پر راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ ظالم ضحاک نے چند سال اس خوفناک حالت میں گزارے۔ اُس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ ایران کی سرزمین کا چپہ چپہ چھان ماریں اور جس گھر میں فریدون نامی بچہ پیدا ہو' اس گھر کے تمام افراد کے سر تن سے جدا کر دیں۔

چند سال تک ضحاک کے سپاہیوں کی تمام تر کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ ضحاک اس صورت حال سے سخت پریشان اور غصے میں تھا۔ آخرکار سپاہیوں کو ایک دن معلوم ہوا کہ دور دراز کے گاؤں میں ایک میاں بیوی کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے اور انہوں نے اس کا نام "فریدون" رکھا ہے۔ فریدون کے ماں باپ کو اس بات کا بالکل علم نہیں تھا کہ بادشاہ کے سپاہی ان کے ننھے منے معصوم لخت جگر کی تلاش میں ہیں اور ان سب کو موت کے گھاٹ اُتارنا چاہتے ہیں۔

فریدون کے والدین غریب اور تنگدست ہونے کے باوجود اس بیٹے کی پیدائش پر بے حد خوش تھے اور اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت تصور کرتے تھے کہ اللہ نے ان کو بڑھاپے کا سہارا عطا کیا ہے۔ فریدون کا باپ ہر روز صبح سویرے کھیتوں کو نکل جاتا اور سورج غروب ہونے تک کام کاج میں مشغول رہتا۔ فریدون کی ماں دن بھر گھر کے کام کرنے میں لگی رہتی اور اپنے ننھے بچے کی دیکھ بھال کرتی رہتی۔

ایک دن ضحاک کے سپاہی اس گاؤں میں آ پہنچے جہاں فریدون اور اس کے امی ابو رہتے تھے۔ وہ گاؤں کے جس آدمی کو دیکھتے اس سے پوچھتے کہ آپ کے بیٹوں کا کیا نام ہے؟ وہ گھروں میں بھی جاتے اور طرح طرح کے سوالات پوچھ کر لوگوں کو تنگ کرتے۔ ایک دن شام کے وقت سپاہی فریدون کے باپ کے کھیتوں میں آن دھمکے فریدون کا والد گھر جانے کے لیے اپنا سامان باندھ رہا تھا

کہ اچانک اس نے گھوڑوں پر سوار چند سپاہیوں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ جب سپاہی اس کے پاس پہنچے تو ان میں سے ایک نے پوچھا: "اے جوان تیرا نام کیا ہے اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

فریدون کے باپ نے اپنا تعارف کرایا اور بولا کہ میں ایک زمیندار ہوں اور یہ کھیت میرے ہیں۔

"کیا تیرا کوئی بیٹا بھی ہے؟" ایک دوسرے سپاہی نے پوچھا۔

فریدون کا باپ بیچارہ ایک سیدھا سادا زمیندار تھا اور تمام حالات سے بالکل بے خبر تھا۔ اس نے جواب دیا: "ہاں، ابھی حال ہی میں اللہ نے مجھے ایک چاند سا بیٹا دیا ہے اور ہم نے اس کا نام فریدون رکھا ہے"۔

سپاہیوں نے جونہی "فریدون" کا نام سنا تعجب اور حیرت سے وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ان کی کئی سالوں کی پریشانی اور آوارہ گردی ختم ہو چکی تھی۔ وہ جس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے انہیں وہ بچہ مل چکا تھا۔ سپاہیوں نے فوراً فریدون کے باپ کو گرفتار کر لیا اور اپنے سردار کے پاس لے گئے۔ سردار نے جب تمام ماجرا سنا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سردار کی کئی سال پرانی دلی آرزو پوری ہو چکی تھی۔ ظالم سردار نے فریدون کے بے گناہ باپ کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ سپاہیوں نے دیکھتے ہی دیکھتے بیچارے کو خون میں نہلا دیا اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

ادھر فریدون کی ماں اپنے شوہر کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے شوہر کے آنے میں جس قدر دیر ہو رہی تھی اس کی بے چینی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ جب بہت زیادہ دیر ہو گئی اور ہر طرف رات کا اندھیرا چھا گیا تو فریدون کی ماں نے فریدون کو اٹھایا اور رات کے اندھیرے میں اپنے شوہر کی تلاش میں گھر سے باہر نکل گئی۔ راستے میں اس کو گاؤں کے ایک آدمی نے بتایا کہ ظالم ضحاک کے سپاہیوں نے تیرے بے گناہ شوہر کو مار ڈالا ہے اور اب تیرے ننھے فریدون کی جان لینے تمہارے گھر کی طرف گئے ہیں۔

فریدون کی ماں نے جونہی یہ خبر سنی تو سخت پریشان ہو گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہونے لگی۔ یہ ہولناک خبر دینے والے آدمی نے اسے حوصلہ دیا اور بولا: "بی بی اگر حوصلے اور عقل سے کام نہیں لوگی تو تم اپنی اور معصوم فریدون کی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گی"۔

فریدون کی ماں نے اپنی گریہ و زاری پر قابو پایا اور اپنی اور فریدون کی جان بچانے کے لیے اس گاؤں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ رات کی تاریکی میں ضحاک کے سپاہیوں کے ہاتھ آنے سے بچ گئی اور کئی دن اور راتیں بھاگتے بھاگتے ایک وسیع جنگل میں پہنچ گئی۔ سرسبز جنگل میں اس نے ایک گائے کو چرتے ہوئے دیکھا۔ ایسی گائے اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس گائے کے بال مور کے پروں کی طرح رنگ برنگے تھے۔ فریدون کی ماں گائے کے خوبصورت رنگوں میں اس طرح کھو گئی کہ اسے گائے کا نگہبان نظر ہی نہ آیا جو اُسی کی طرف آ رہا تھا۔ نگہبان جب قریب پہنچا تو بولا: "اے خاتون، تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میرا نام فرانک ہے اور میں بھوکی اور پیاسی ہوں اور میں اس علاقے میں نئی آئی ہوں۔ یہاں مجھے جاننے والا کوئی نہیں ہے"۔ فریدون کی ماں نے جواب دیا۔

گائے کا رکھوالا ایک شریف اور نیک دل آدمی تھا۔ وہ فرانک کو اپنے گھر لے گیا اور اسے کھانا دیا اور آرام کرنے کے لیے جگہ دے دی۔ کھانا کھانے اور کچھ آرام کرنے کے بعد فرانک نے پوچھا۔ "بھائی، جنگل میں رنگ برنگی گائے میں نے دیکھی ہے وہ کیسی گائے ہے؟"

"اس کا نام "برمایہ" ہے اور پوری دنیا میں اس جیسی گائے نہیں ہے"۔ رکھوالے نے جواب دیا۔

"میرے نیک دل اور شریف بھائی! اگر تو میرے بچے کی دیکھ بھال کرے اور اس گائے کا دودھ پلائے تو آپ مجھے جو خدمت کہیں گے میں انجام دوں گی"۔ فرانک بولی۔

رکھوالے نے فرانک کی یہ پیشکش قبول کر لی۔ اسکے بعد فرانک جنگل کے ساتھ والے گاؤں میں روز جاتی اور سارا دن محنت مزدوری کرتی۔ وہ جو کچھ کماتی رکھوالے کو اجرت کے طور پر ادا کر دیتی۔ اب وہ ضحاک کے سپاہیوں سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو اکیلی عورت کے طور پر ظاہر کر سکتی تھی۔ اس بات کو تین سال گزر گئے۔ ان تین سالوں میں رکھوالے نے "برمایہ" نامی گائے کے دودھ سے فریدون کی پرورش کی۔ اس خوبصورت اور رنگ برنگی

کوہ البرز پر شدید دھند تھی۔ وہ
جس قدر پہاڑ کے اوپر چڑھتی جا
رہی تھی سردی میں اضافہ ہوتا جا
رہا تھا۔ وہ اوپر چڑھتے چڑھتے کوہ
البرز کی ایک خوبصورت اور
سرسبز چوٹی پر پہنچ گئی۔ فرانک کو
سرسبز چمن زار کے درمیان
ایک عبادت گاہ کی عمارت نظر
آئی۔ وہ اس عبادت گاہ کو دیکھ کر
اس قدر خوش ہوئی کہ سفر کی
تمام تھکاوٹ دور ہو گئی۔ اس
نے گھوڑے کو دوڑایا اور عبادت
گاہ کے قریب پہنچ گئی۔ فرانک
کو عبادت گاہ میں ایک بزرگ
نظر آئے جو خدا کی عبادت
کرنے میں مشغول تھے۔ بزرگ
جب عبادت سے فارغ ہوئے
تو فرانک ان کے قریب چلی گئی

اور بزرگ کی خدمت میں سلام عرض کیا۔ بزرگ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرانک کی طرف دیکھا اور بولے:

فرانک نے اپنے آپ پر قابو پایا اور بابا جی کو شروع سے آخر تک ضحاک کے سپاہیوں کے ہاتھوں اپنے شوہر کی ہلاکت کی داستان کہہ سنائی۔ بابا جی نے ظلم اور بے انصافی کی جب یہ داستان سنی تو بہت افسردہ ہوئے اور غمگین لہجے میں بولے: "بیٹی، تم اپنے بیٹے کے ساتھ اس عبادت گاہ میں رہ سکتی ہو۔ اگر خدا نے چاہا تو تمہارا فریدون یہیں جوان ہو گا اور ظالم ضحاک سے نہ صرف اپنے بے گناہ باپ کے خون کا بدلہ لے گا بلکہ ایران کے لوگوں کو اس ظالم کے ظلم سے نجات دلائے گا"۔

فرانک نے بابا جی کی جب یہ بات سنی تو اسکی آنکھیں حیرت اور خوشی سے چمک اٹھیں۔

(باقی آئندہ)

☆☆☆

گائے کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

اب ذرا شاہی دربار کا حال سنیے! فریدون کا جب کوئی سراغ نہ ملا تو ضحاک نے عاملوں اور نجومیوں سے دوبارہ رجوع کیا۔ نجومیوں نے ضحاک کو بتایا کہ فریدون کسی جنگل میں "برمایہ" نامی گائے کے دودھ سے پرورش پا رہا ہے۔ ضحاک نے سپاہیوں کو جنگل کی طرف روانہ کر دیا تاکہ وہ فریدون اور برمایہ کو ہلاک کر دیں۔

فرانک نے جب کہیں سے سنا کہ بادشاہ کے سپاہی فریدون اور برمایہ کی تلاش میں جنگل جنگل پھر رہے ہیں، وہ بھاگی بھاگی رکھوالے کے پاس آئی اور اس سے اپنے بچے کو لے کر گھوڑے پر سوار ہو کر اس جنگل سے فرار ہو گئی۔ یہ گھوڑا اس نے رکھوالے سے خرید لیا تھا۔ فرانک گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے کوہ البرز کے نزدیک پہنچ گئی۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ جس قدر ممکن ہو وہ کوہ البرز کے اوپر چڑھ جائے تاکہ سپاہیوں کی دسترس سے بچ سکے۔

پربت کے اُس پار

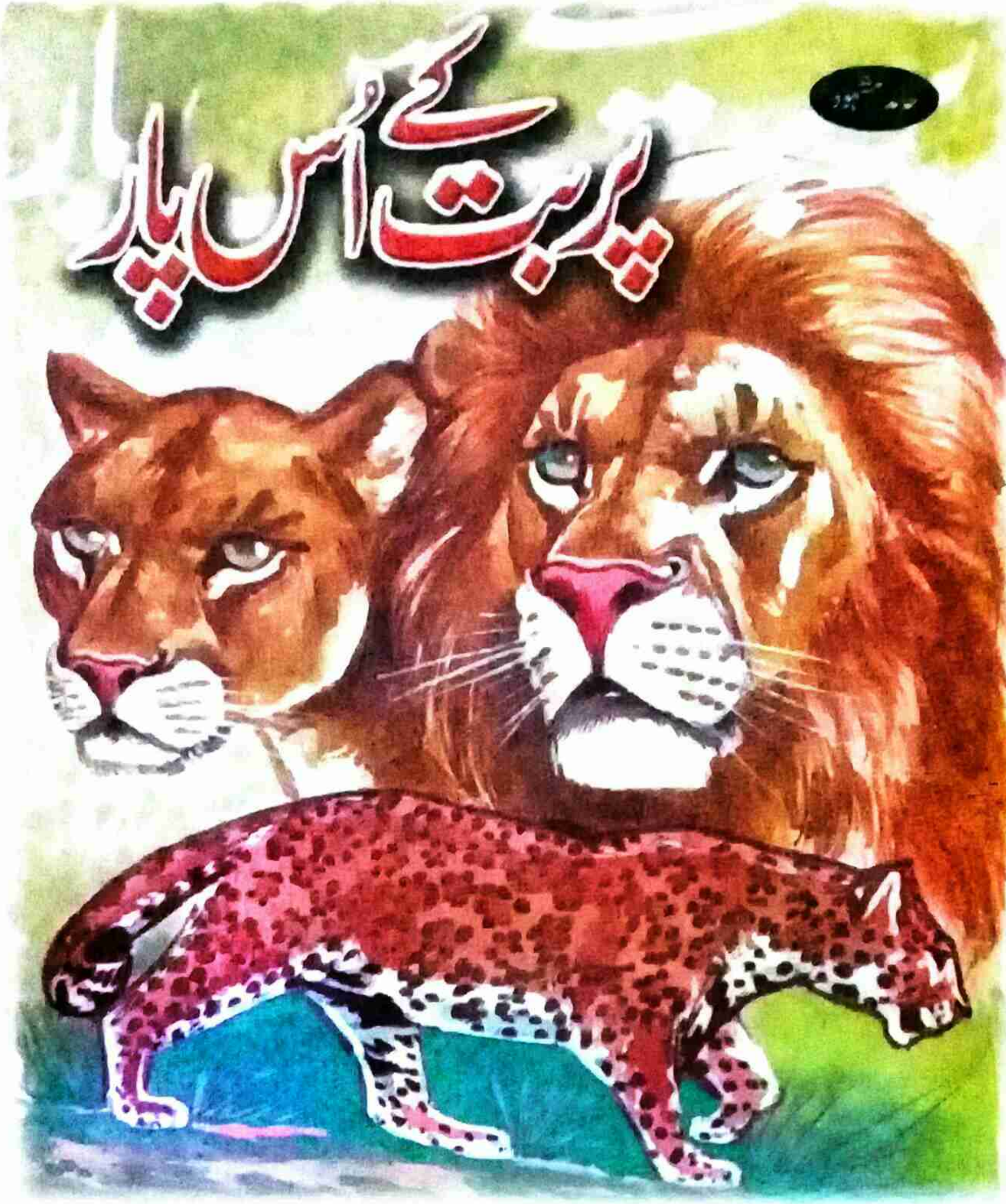

سیاہ پربت اور منہ زور دریا کے پاس ایک بڑا جنگل تھا۔ اس سرسبز جنگل میں شیروں کے ایک جوڑے کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ شیروں کا وہ جوڑا ایک نایاب نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ دونوں یعنی شیر اور شیرنی مل کر شکار کرتے تھے۔ اس طویل و عریض جنگل میں بھیڑیے' چیتے اور گل دار بھی موجود تھے یعنی چھوٹے شیر۔ ان سب درندوں کو شیروں کی برتری پسند نہیں تھی۔ ہر کوئی اس دنیا میں اپنا اپنا لوہا منوانا چاہتا تھا۔

ایک دن ایک تیندوا شیر اور شیرنی سے ملنے گیا۔ اسے کچھ دوسرے درندوں نے سمجھا بجھا کر روانہ کیا تھا۔ اس نے ان دونوں کی طاقت اور شجاعت کے گیت گائے اور پھر پوچھا "کیا آپ نے کبھی انسان کا گوشت کھایا ہے؟"

ان دونوں کا جواب تھا کہ نہیں۔

"جناب عالی! انسان کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے' مزے دار اور پرلطف ہوتا ہے"۔ شیرنی نے پوچھا "تم نے انسان کا گوشت کھایا ہے؟"

تیندوا بولا "محترمہ! میں کئی بار انسان کا گوشت کھا چکا ہوں"۔

پھر پل بھر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ شیروں کا جوڑا انسانی گوشت کے متعلق غور و فکر کر رہا تھا۔ تیندوا انہیں اکسانے کے لیے بولا "مجھے تو بہت حیرت ہوئی کہ آپ نے ابھی تک کوئی انسان نہیں مار کھایا...... افسوس کہ آپ اپنی بھرپور جوانی کو پرلطف نہیں بنا رہے"۔

ان شیروں نے اپنی عقل پر زیادہ زور دینا پسند نہ کیا اور انسان کو کھانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تیندوا خوش ہو گیا کہ یہ شیر کسی انسان کو مار کر کھائیں گے تو انہیں انسانی گوشت اور لہو کی چاٹ لگ جائے گی اور پھر یہ کسی دن انسانی گوشت کے چکر میں' آدم خور ہونے کی وجہ سے کسی شکاری کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔ تیندوا بولا "آج کل دریا کا زور ٹوٹا ہوا ہے۔ پانی کا مزاج دھیما ہے اور برسات کی طغیانی کم ہو چکی ہے۔ آپ پربت کے اس پار جا کر کوئی انسان کھا سکتے ہیں"۔

شیروں نے اسی وقت تیاری کی اور دریا کا رخ کیا۔ انہیں راہ میں ایک بوڑھا ہاتھی ملا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا "تم دونوں کہاں جا رہے ہو؟"

"ہم انسانوں کو کھانے جا رہے ہیں" شیرنی بولی "پربت کے اس پار"

"مجھے آپ لوگوں کی سوچ پر افسوس ہوا ہے" ہاتھی بولا۔

"وہ کیوں؟ شیر نے پوچھا۔

"اس لیے کہ انسان شیر کی خوراک میں شامل نہیں ہوتا۔ شیر کی خوراک میں پہاڑی بکرا' نیل گائے' ہرن' چیتل' چنکارا' زیبرا اور بارہ سنگھا وغیرہ جیسے جانور شامل ہوتے ہیں"۔ ہاتھی نے جواب دیا۔

"مگر انسان کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے" شیر اکتا کر بولا۔

"اور انسان کی عقل بھی بہت لذیذ ہوتی ہے۔ انسانی عقل جانوروں کو تگنی کا ناچ نچاتی ہے"۔ ہاتھی نے انہیں خبردار کیا۔

"ہم طاقت ور ہیں اور عقل بھلا طاقت کا مقابلہ کیسے کرے گی؟" شیرنی بولی۔

"ہاتھی بھی بہت طاقت ور ہوتا ہے۔ ہاتھی بڑے بڑے پتھروں کو اپنی ٹکر سے لڑھکا دیتا ہے۔ یہ جانور تناور درخت کے گرد اپنی سونڈ لپیٹ کر اُسے جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے' مگر کسی ہاتھی کی طاقت اس عقل کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو انسان کو قدرت نے دی ہے"۔ ہاتھی نے انہیں سمجھایا۔ "آپ اب بوڑھے ہو گئے ہیں اس لیے آپ کی آرزوؤں نے بھی دم توڑ دیا ہے۔ ورنہ آپ جیسے "عظیم ہاتھی" کے سامنے انسان دم نہ مارتا' پہاڑ سے ٹکرانا کون پسند کرتا" شیر نے کہا "آپ گنے چوستے رہ گئے اور کمزور انسان کو زیر نہ کر سکے"۔

"میری عمر 70 سال ہے برخوردار! میں بہار خزاں' بھوک ننگ' سب کچھ دیکھ چکا ہوں۔ میں چھ بچوں کا باپ اور کئی بچوں کا نانا دادا ہوں۔ میرے تجربے سے فائدہ اٹھاؤ اور واپس لوٹ جاؤ!" بوڑھے ہاتھی نے انہیں نصیحت کی۔

شیروں کا جوڑا سنی ان سنی کر کے چل دیا۔ انہوں نے دریا تیر کر بخوبی پار کر لیا کیوں کہ موسم سرما کا آغاز ہو رہا تھا اور برساتی پانی ختم ہو چکا تھا۔ ایک رات ان دونوں نے پربت پر گزاری اور دوسرے دن آبادی کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ کھیتوں میں جا پہنچے جہاں کچھ کچھ فاصلے پر چند کسان کام میں مصروف تھے۔ شیر اور شیرنی' دونوں ایک بوڑھے کسان کے سر پر جا پہنچے جو اپنی فصل میں نلائی کر رہا تھا۔ شیر کی دہاڑ سن کر اس کی گھگی بندھ گئی۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔

شیرنی نے اسے خبردار کیا "ہم تجھے کھانے آئے ہیں"۔

شیر نے بتایا "ہم انسان کھانے کے لیے لمبا فاصلہ طے کر کے آئے ہیں"۔

بوڑھا کسان سنبھل گیا۔ اس نے خوشامد کی۔ "میں صدقے' میں قربان' تم دونوں مجھے خوب کھاؤ' ضرور کھاؤ مگر میں بوڑھا آدمی ہوں' تمہیں مزہ نہیں آئے گا۔ میں تو حاضر ہوں مگر میرا لہو اب لذیذ نہیں رہا۔ میری ہڈیاں

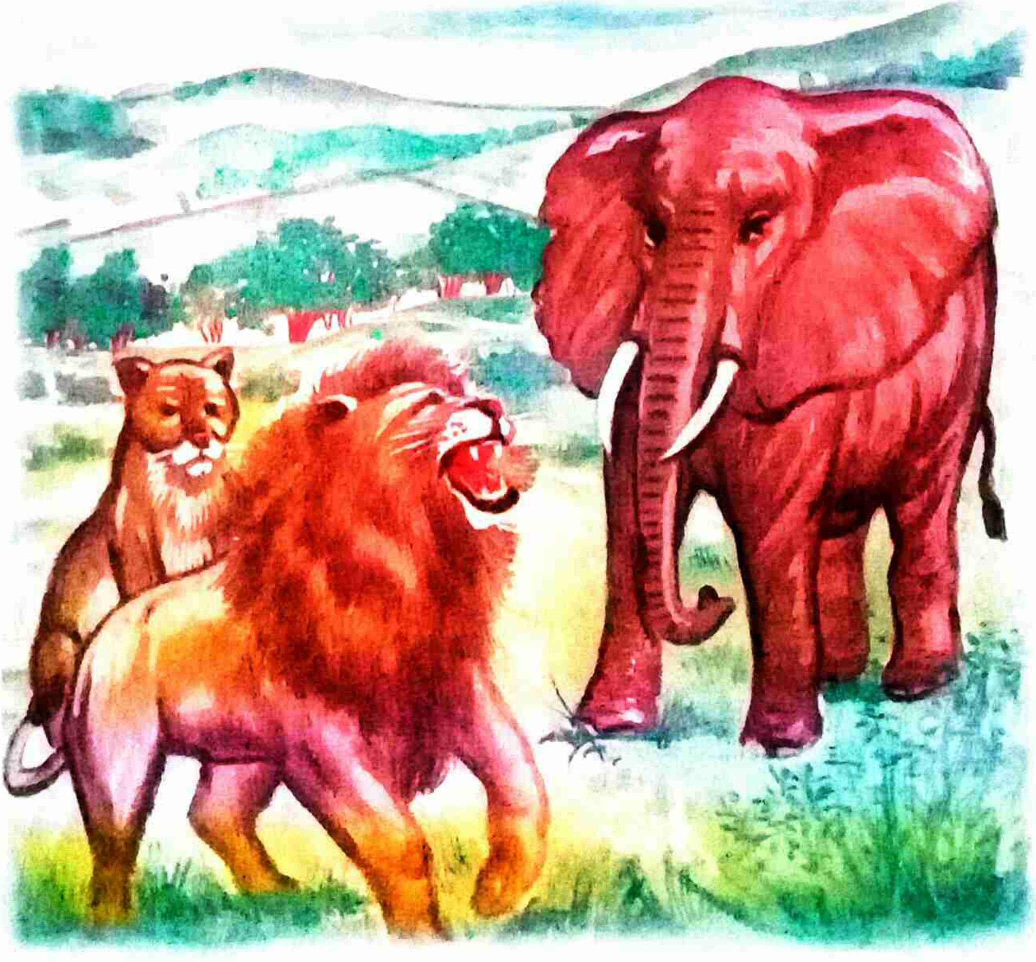

تم خود دیکھ سکتے ہو۔ میرا گوشت تمہیں کیا خاک مزہ دے گا۔ میری ہڈیاں بھی بھربھری ہوں گی۔ مجھے کھا کر تمہیں کچھ مزہ نہ آئے گا۔ میری جان جائے گی' تم لوگوں کا چسکا پورا نہ ہو گا۔ تم اتنا فاصلہ طے کر کے آئے ہو میرا بوڑھا اور سخت بدن چبا کر اپنے پیٹ تھام لو گے...... فائدہ؟ وہ سامنے ایک جوان کسان ہل چلا رہا ہے تم اسے کھا کر مزے اڑاؤ"۔

شیروں نے جوان کسان کو جالیا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ بوڑھے کسان نے شیروں کو پٹی پڑھا کر اسکی طرف روانہ کیا ہے۔ وہ سکون سے ہل چلاتا رہا۔

"او کسان!" شیر گرجا۔

"جی حیوان!" کسان نے ہم قافیہ جواب دیا۔

"ہم تجھے کھانا چاہتے ہیں"۔ دونوں دھاڑے۔

"کیوں جنگل میں ہرن اب نہیں رہے کیا؟ کسان نے پوچھا۔

"ہم جوان انسان کی ضیافت اڑانا چاہتے ہیں"۔ شیرنی مسکرا کر بولی۔

اپنا ہل روک کر کسان بولا "جوان انسان کو ہضم کرنا آسان نہیں۔ پچھلے برس ایک تگڑا شیر ادھر آن نکلا تھا۔ اس نے ایک جوان کسان کو زبردستی کھا لیا اور وہیں پر تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم کسی ادھیڑ عمر انسان کو کھاؤ اور جان بناؤ"۔

کسان ایک مضبوط جوتا پہنے ہوئے تھا۔ اس نے اپنا پاؤں شیر کے منہ میں دے کر اسے کہا "میرا پاؤں تو چبا کر دیکھو ذرا"۔

شیر نے ڈرتے ڈرتے کسان کا پاؤں ذرا چبانے کی کوشش کی تو اس کے دانت سخت چمڑے پر کچکا کر رہ گئے۔ وہ مان گیا کہ جوان کسان کو کھانا اور پھر ہضم کرنا ہر شیر کے بس کا روگ نہیں۔

چنانچہ اُس کسان نے انہیں ایک ادھیڑ عمر کسان کی طرف روانہ کر دیا۔

وہ ادھیڑ عمر کسان رہٹ چلا کر اپنے کھیتوں کو سیراب کر رہا تھا۔ اُس نے دور سے دیکھ لیا تھا کہ شیر کسانوں کے ساتھ مذاکرات کرتے پھر رہے ہیں۔ شیر جب رہٹ کے پاس پہنچے تو رہٹ چلانے والی اونٹنی بدک کر رک گئی اور اُچھل کود کرنے لگی۔ کسان نے اپنی اونٹنی کو پچکار کر رام کیا اور ان نووارد شیروں کو خوش آمدید کہا۔ شیر نے ڈکارتے ہوئے اپنے لمبے اور مضبوط دانتوں کی نمائش کرنے کے بعد اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ کسان نے حیرانی کا اظہار کیا اور کہا "مجھے بہت افسوس ہے کہ تم لوگوں نے اتنی جستجو کے بعد ایک غریب کسان کا انتخاب کیا۔ صحت کا خوراک سے بہت تعلق ہے۔ میں جو کی روٹی اور دال دلیہ کھاتا ہوں۔ زیادہ عیاشی کی تو ذرا اونٹنی کا دودھ پی لیا۔ اب تم مجھ پر محنت بھی کرو اور لذت بھی نہ پاؤ تو کیا حاصل؟"

شیروں نے اس کے کمزور بدن پر نگاہ ڈالی اور خوراک اور بدن کے فلسفے پر غور کرنا شروع کر دیا۔

کسان نے ان کی رہنمائی کی "میرے عزیز ہم وطن شیرو! اس راہ سے ہمارے گاؤں کا سردار ابھی ابھی اپنے عربی گھوڑے پر سوار ہو کر گزرا ہے' اس کا رخ شہر کی طرف تھا۔ تم تیز رفتار ہو' جلد ہی اس کو جالو گے۔ سردار خوب طاقت ور ادھیڑ عمر شخص ہے۔ میں مشقت کرتا ہوں وہ آرام کرتا ہے۔ میں روٹی کھاتا ہوں وہ تیتر بٹیر اڑاتا ہے۔ میرا چہرہ زرد ہے اور اس کے چہرے سے سرخ لہو ٹپکتا ہے۔ تم اس سے زیادہ لذیذ کوئی اور انسان اس گاؤں میں نہیں پاؤ گے۔ وقت ضائع نہ کرو اور سردار کو قابو کر لو۔ اس کے لہو میں طرح طرح کے پھلوں کی لذت اور قوت موجود ہے' وہ پھل کھانے کا بہت شوقین ہے"۔

شیروں نے سردار کے گھوڑے کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ کچے راستے پر دھول اڑاتے جا رہے تھے۔ انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے سردار کو جالیا۔ سردار کا گھوڑا دلکی چال چل رہا تھا اور وہ خود اپنے تھیلے میں سے تازہ ناریل نکال نکال کر کھا رہا تھا۔ شیروں نے اس کی خوراک دیکھ کر اس کے بدن پر بھرپور نگاہ ڈالی۔ وہ توانا مرد تھا' عمر پچاس سال' قد لمبا' جسم مضبوط اور ہاتھ پیر بڑے بڑے۔ اس کا چہرہ قندھاری انار کی طرح سرخ تھا۔

شیرنی نے نعرہ بلند کیا "آہا ہمیں ہماری منزل مل گئی ہے"۔

سردار نے گھبرا کر ان سے ماجرا دریافت کیا۔ ساری داستان سن کر وہ مسکرایا اور بولا "میرے پیارے شیرو! تم یہاں میرے مہمان ہو۔ تم مجھ غریب کو کھا کر اپنے سارے ارمان پورے کر لو مگر مجھے صرف اتنی مہلت دے دو کہ میں اپنی پیاری بیٹی پارو کو شہر

سے زیور لا دوں کیوں کہ کل صبح اس کی شادی ہے"۔

شیر بولا "تمہاری بیٹی ہماری بھی بیٹی ہے۔ ہم تمہارے گھر جا کر تمہارا انتظار کرتے ہیں۔ تم اپنی بیٹی کو زیور لا دو پھر تم آرام سے ہمارے آگے لیٹ جانا اور ہم تجھے کچا چبا جائیں گے"۔

عیار سردار بولا "نہیں تم میرے ساتھ شہر چلو۔ پھر ہم واپس لوٹ آئیں گے"۔

شیر راضی ہو گئے۔ سردار نے اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑا لیا۔ شیر بھی خالص جنگلی خوراک کے بل بوتے پر جست پر جست لگاتے گئے اور جلد ہی فاصلہ تمام ہوا۔ سردار کی کمر کے ساتھ بندھی نیام میں تیز دھار تلوار موجود تھی مگر اس کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ سردار نے سنار سے زیور کا ڈبا لیا اور پھر اپنی جیب ٹٹول کر پریشان ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کے پرانے ملازم نے اس کے سر پر تیل کی مالش کرتے ہوئے ساری رقم اس کی جیب سے نکال لی تھی۔ پھر اس نے ان شیروں کو سنار کے ہاں بٹھا کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

وہ زیور اگرچہ لاکھوں روپے کے تھے تاہم اُسے یہ بھی اندازہ تھا کہ وہ شیر بھی لاکھوں روپے کے ہیں۔ سردار نے انہیں ضمانت کے طور پر وہاں بند کیا تھا کہ میں رقم لے کر آج ہی لوٹ آؤں گا۔ اس نے ان سعادت مند شیروں کو اپنے پالتو شیر ظاہر کیا تھا۔ وہ زیور لے کر اپنے گاؤں کی طرف چل دیا۔

کچھ دنوں کے بعد بھی سردار واپس نہ آیا۔ سنار اس کا اتا پتا نہ جانتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گھڑ سوار امیر آدمی اپنے شیروں کو لینے کے لیے ضرور رقم لے آئے گا۔ سنار دو دن گھڑ سوار کا انتظار کرتا رہا۔ وہ بہت تنگ پڑ گیا تھا۔ اس کے بیوی بچے دوسرے گھروں میں رہ رہے تھے کیوں کہ اس کے اپنے گھر میں شیر بند تھے۔ آخر کار سنار نے بڑے شہر میں موجود چڑیا گھر کی انتظامیہ کو اطلاع دی اور شیروں کو فروخت کر دیا۔ چڑیا گھر کے ماہرین ان شیروں کو قابو کر کے چڑیا گھر میں لے گئے اور انہیں پنجرے میں قید کر دیا۔

شیر پنجرے میں بند ہو کر اداس ہو گئے۔ ان کی اچھل کود ختم ہو گئی اور انہوں نے انسانوں کے ساتھ بات چیت بالکل ختم کر دی۔ اس بات کو گزرے اب بہت عرصہ ہو چلا ہے۔ اب دنیا کے کئی چڑیا گھروں میں ان کی اولاد موجود ہے مگر وہ سب گم صم رہتے ہیں، کسی کے ساتھ کوئی بات نہیں کرتے البتہ آپ انہیں کبھی کبھار دھاڑتے ہوئے ضرور پائیں گے۔ ان کی ہر دھاڑ ہمیں تین اخلاقی سبق دیتی ہے۔

اول یہ کہ لالچ بری بلا ہے۔ لالچ ہی ان شیروں کو جنگل سے نکال کر پربت کے اُس پار لایا تھا۔ دوسری بات یہ کہ وہ احمق تھے۔ احمق کو ہر کوئی اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنا ہر فیصلہ عقل سے اور سوچ سمجھ کر کریں۔ تیسرا سبق یہ ہے کہ بڑوں کا کہنا نہ ماننے والے ہمیشہ خطا کھاتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا بچو!

☆☆☆

2003 کرکٹ ورلڈ کپ

سید شوکت اعجاز

پاکستان۔ بھارت
روایتی حریف کرکٹ کے میدان میں

جدید دور میں کوئی قوم جس قدر کھیل کے میدان میں کامیاب ہو گی اُسی قدر اس کی قومی صحت اور کارکردگی کا معیار بلند اور قابل رشک ہو گا۔ ایک چاق چوبند کھلاڑی بین الاقوامی مقابلوں میں ایک طرح سے اپنی قوم کے نظم و ضبط اور رجحانات کی نمائندگی کرتا ہے اور یہی قومی جذبہ اُسے اور اس کی ٹیم کو کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار کرتا چلا جاتا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ کرکٹ کا آٹھواں عالمی کپ میلہ فروری کی آٹھ تاریخ سے براعظم افریقہ کے دو ممالک جنوبی افریقہ اور زمبابوے میں بیک وقت جاری ہے اور کرہ ارض کے تمام شائقین کرکٹ کی نظریں اس طرف جمی ہوئی ہیں۔

کرکٹ کا عالمی کپ کس ملک کے حصے میں آئے گا، فی الحال اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دراصل کرکٹ ایک ایسا کھیل ہے جس میں قیاس آرائیاں تو کی جا سکتی ہیں لیکن حتمی نتیجے کے بارے میں پیشن گوئی ذرا مشکل کام ہے۔ خاص طور پر ایک روزہ میچوں میں تو کسی بھی ٹیم کو کمزور یا ناقابل شکست نہیں سمجھا جا سکتا۔ اب دیکھیں 23 مارچ کو فائنل میں کونسی دو ٹیمیں مدمقابل آتی ہیں۔

یکم مارچ کو جس وقت آپ کا محبوب رسالہ "تعلیم و تربیت" آپ کے ہاتھ میں ہو گا، دو روایتی حریف: پاکستان اور بھارت کا مقابلہ کرکٹ کے میدان میں ہو رہا ہو گا۔ اس ٹورنامنٹ کا یہ سب سے اہم اور سنسنی خیز مقابلہ ہے جس کا پوری دنیائے کرکٹ کو بے چینی سے انتظار ہے۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک روزہ مقابلوں کی ابتدا 1982-83 کے سیزن میں ہوئی تھی۔ پاکستان نے یہ سیریز 3-1 کی واضح برتری سے حاصل کی۔ اس کے بعد آج تک کھیلے گئے میچوں میں اوسطاً پاکستان کا پلہ ہمیشہ بھاری رہا ہے۔ شاید اسی وجہ

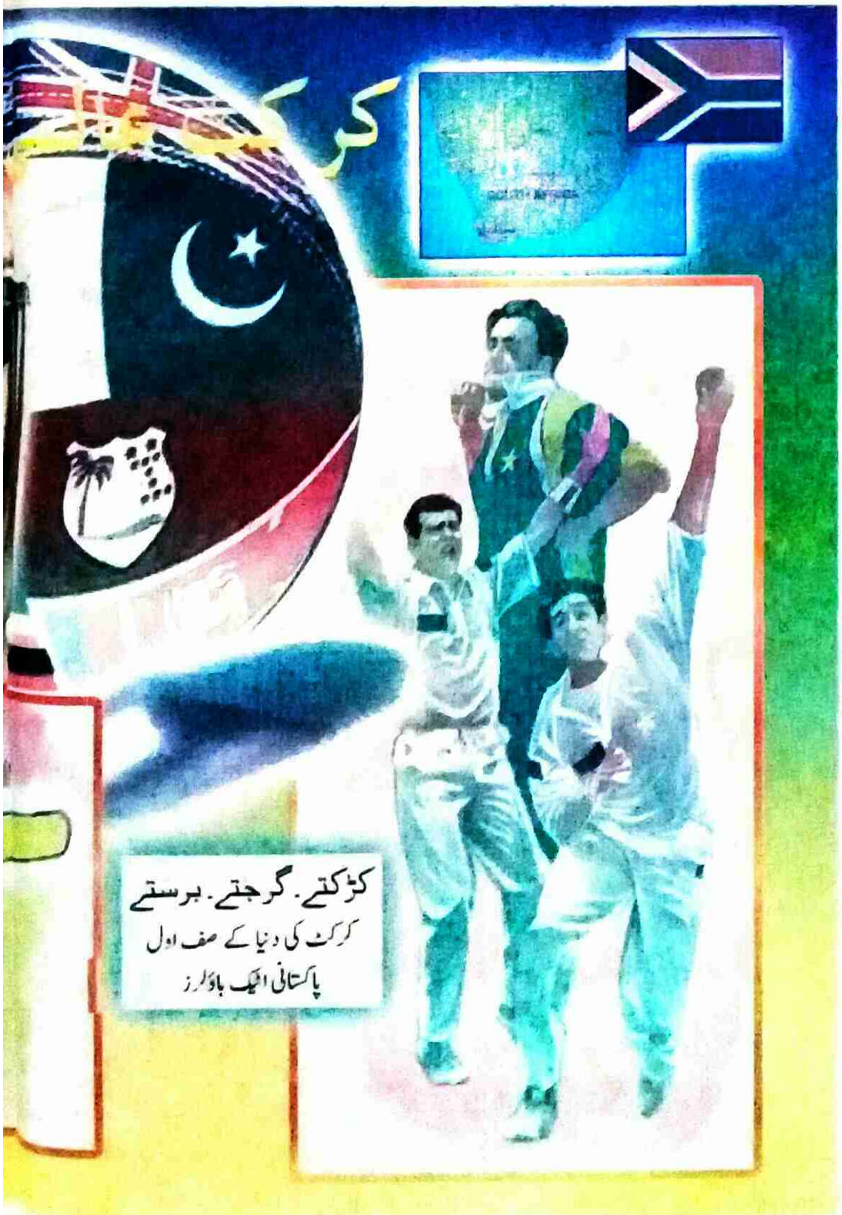

کڑکتے۔ گرجتے۔ برستے
کرکٹ کی دنیا کے صف اول
پاکستانی اٹیک باؤلرز

سے بھارتی ٹیم ہمیشہ دباؤ میں کھیلتی ہے اور اب تو بھارت پچھلے کئی سالوں سے پاکستان کا مقابلہ کرنے سے کترا رہا ہے۔ آپ کو یقیناً 18 اپریل 1986ء کے دن شارجہ میں کھیلا گیا میچ یاد ہو گا جس میں جاوید میاں داد نے آخری بال پر چھکا لگا کر پاکستان کو ناقابل یقین فتح سے ہمکنار کیا تھا۔ اس شکست کی خفت اور شرمندگی اب تک بھارتی ٹیم کے ذہنوں پر سوار ہے اور اسی وجہ سے پاکستان کو ہمیشہ نفسیاتی برتری حاصل رہی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس مرتبہ بھی پاکستانی ٹیم کے جواں ہمت کھلاڑی پورے عزم اور حوصلے کے ساتھ میدان میں اتریں گے۔ جنوبی افریقہ میں مقیم صرف ان دو ممالک کے عوام ہی اس مقابلے کو دیکھنے کے لیے بے چین نہیں بلکہ پوری دنیا منتظر ہے۔ اس میچ کی مقبولیت اور انتظار کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف اس میچ کی ٹکٹیں ٹورنامنٹ کے آغاز سے بیس روز قبل ہی فروخت ہو چکی تھیں۔

چمکتا دمکتا زیبرا
(DAZZLER)
جنوبی افریقہ میں عام پایا جانے والا چوپایہ 'زیبرا' ورلڈ کپ 2003ء کیلئے بطور MASCOT (باعث برکت علامت) منتخب کیا گیا ہے اور اسے DAZZLER کا نام دیا گیا ہے۔

یہ مقابلہ ساؤتھ افریقہ کے معروف گراؤنڈ "سینچورین پارک" میں کھیلا جائے گا اس گراؤنڈ کا افتتاح 1995ء میں ہوا تھا اور یہ اس وقت تک ساؤتھ افریقہ کا آٹھواں ٹیسٹ سنٹر تھا۔ اس گراؤنڈ پر سب سے زیادہ سکور جنوبی افریقہ نے نیوزی لینڈ کے خلاف 4 وکٹوں پر 324 رنز بنایا اور سب سے کم سکور 145 رنز پاکستان نے ساؤتھ افریقہ کے خلاف کیا۔ اسی اسٹیڈیم میں سب سے زیادہ وکٹ لینے والا باؤلر ساؤتھ افریقہ کا شان پولاک ہے۔ جس نے بھارت کے خلاف 37 رنز دے کر پانچ وکٹیں لیں۔ یہاں کھیلے گئے میچوں میں صرف پاکستان اور آسٹریلیا اور بھارت نے دو دو بار فتح حاصل کی اور ایک ایک میچ ہارے ہیں۔ اس لیے اس گراؤنڈ کو "مہمان نواز" کہا جاتا ہے۔ لیکن اس بار یکم مارچ کا مقابلہ تو دونوں "مہمانوں" کے درمیان ہو گا! اس سے قبل 25 فروری کو بھارت اپنے گروپ کا ایک میچ آسٹریلیا کے خلاف کھیل چکا ہو گا اور اُسے مقابلے کی سختی اور معرکہ آرائی سے اس پچ اور گراؤنڈ کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا۔ تاہم یکم مارچ کو اس کا مقابلہ جس روایتی حریف ٹیم کے ساتھ ہے اس کے جوش و جذبے اور فولادی عزم کے بارے میں پوری دنیا جانتی ہے۔

ہمارے تمام اہلِ وطن، خاص طور پر "تعلیم و تربیت" کے ننھے اور ہونہار قارئین کی دلی ہمدردیاں یقیناً پاکستانی ٹیم کے ساتھ ہیں اور وہ پاکستان کی سربلندی اور ٹیم کی فتح و نصرت کے لیے دل و جان سے دعاگو بھی ہوں گے۔ پاکستانی ٹیم نظم و ضبط، جوش و ولولے اور انتھک محنت کے اعتبار سے دنیا کی کسی دوسری ٹیم سے کسی بھی طور کم نہیں۔ آیئے، آپ اور ہم اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کریں کہ وہ مخالف ٹیم کا غرور اور گھمنڈ خاک میں ملائے اور اس کے مقابلے میں پاکستانی ٹیم کو فتح و کامیابی سے ہمکنار کرے اور ہمارے جواں ہمت کھلاڑی اللہ کے فضل و کرم سے عالمی کپ جیت کر وطن واپس لوٹیں! (آمین)

پہلا سیمی فائنل	18 مارچ	بمقام: پورٹ الزبتھ
دوسرا سیمی فائنل	20 مارچ	بمقام: ڈربن
فائنل	23 مارچ	بمقام: جوہنسبرگ

اس ماہ کا شمارہ زبردست اور مزے دار کہانیوں کے ساتھ ملا۔ روبوٹ کہانی' میں اس کا بندہ بنوں گا' خاص طور پر بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ ہر کہانی کا الگ ہی مزہ تھا۔ ہماری دعا ہے کہ تعلیم و تربیت دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ (روما محمود' راولپنڈی)

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور تعلیم و تربیت کی ترقی اور معیار مزید بلند کرنے کے لیے کوشاں ہوں گے۔ یقیناً تعلیم و تربیت کا معیار بہت بلند ہے۔ اس سے ہمیں بہت سی معلومات اور سبق آموز کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ہمیں "ایک تھا چنوں" ایک کہانی بہادری کی' میں اس کا بندہ بنوں گا' چیونٹی کہانی' واہ جی واہ' بڑی پسند آئی ہیں۔ (مہوش حبیب لاہور)

میں بہت شوق سے تعلیم و تربیت پڑھتی ہوں۔ ماہ فروری کا شمارہ ملا ایک دن میں ہی پڑھ ڈالا۔ کہانیوں میں "ایک کہانی بہادری کی" نمبر لے گئی۔ "صوفی نیاز مند بیل لائے" عید کی مناسبت سے بہت خوب لگی۔ "صحراؤں کی سرزمین" "نیٹ ورک" اور معلومات کی دنیا بہت اچھے سلسلے ہیں۔ ورلڈ کپ کے حوالے سے تازہ ترین معلومات ہم پہنچانے کا بہت بہت شکریہ۔ (فرحانہ شبنم' رحیم یار خان)

فروری 2003ء کا شمارہ مل چکا ہے۔ اخلاقیات سے بھرپور تعلیم و تربیت جیسے رسالے کو پڑھ کر خوشی محسوس ہوتی ہے۔ معلومات' مزاح' کھیل اور مزے مزے کی کہانیوں سے لبریز یہ رسالہ اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اس رسالے کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ہر موقع کی مناسبت سے اس میں کہانیاں' نظمیں اور دوسرے آرٹیکل دیئے جاتے ہیں۔ یقیناً یہی خوبیاں اس کی شہرت اور کامیابی کا باعث ہیں۔
(محمد حسنات' ڈیرہ غازی خان)

محترم ایڈیٹر "تعلیم و تربیت"! کیا حال ہیں آپ کے؟ اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ ہم لوگ تعلیم و تربیت پڑھتے ہیں' بہت اچھا محسوس ہوتا ہے۔ تعلیم و تربیت کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ اچھی اچھی کہانیاں' نظمیں اور معلوم نہیں کیا کیا بچوں کو اس میں پڑھنے کے لیے ملتا ہے۔ غریب بچوں کی حوصلہ افزائی' پڑھائی کے فوائد' نئی نئی معلومات' لطائف' انعامی سکیمیں اور اچھے سے اچھے مضامین بچوں کے لیے خوب تفریح مہیا کرتے ہیں۔ اللہ کرے "تعلیم و تربیت" یوں ہی بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کوشاں رہے۔ (آمین)
(مشہود احمد ڈیرہ غازی خان)

☆ "تعلیم و تربیت" کے بارے میں آپ کے قیمتی خیالات ہمارے لیے حوصلہ افزائی کا باعث ہیں۔ خط لکھنے کا بہت بہت شکریہ!

میں تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتا ہوں اور میرے گھر والے اور تمام بھائی بھی بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ فروری کا شمارہ بہت پسند آیا۔ ایک تھا چنوں اور ایک کہانی بہادری کی بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ میں پہلی دفعہ کسی رسالے میں خط لکھ رہا ہوں۔ اُمید ہے ضرور شامل کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اس رسالے کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی دے آمین! (نعمان مسعود' راولپنڈی)

فروری کا شمارہ موصول ہوا۔ پڑھ کر حد درجہ خوشی ہوئی۔ اس دفعہ تعلیم و تربیت میں تمام کہانیاں بہتر سے بہترین تھیں اور ٹائٹل بھی بہت خوبصورت تھا۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تعلیم و تربیت میں میرا خط شائع کیا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو اور ترقی دے (آمین) (محمد مشتاق حسین قادری' کراچی)

☆ آپ کی نظم بھی موصول ہوئی ہے۔ کشمیر کے حوالے سے آپ کے جذبات کی ہم قدر کرتے ہیں۔

محترم ایڈیٹر صاحب! سلامت رہیں اور پھولوں کی طرح مسکراتے رہیں! فروری کا شمارہ دلچسپ تھا۔ تمام کہانیاں اچھی اور سبق آموز تھیں۔ روبوٹ کہانی' ایک کہانی بہادری کی' ایک تھا چنوں اور واہ جی واہ سب سے نمبر لے گئیں۔

(فقط آپ کے رسالے کا شیدائی: تنویر مہدی' میانوالی)

فروری 2003ء کا رسالہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں شیڈول ورلڈ کپ اور کرامت بخاری کی نظم "ورلڈ کپ کی دنیا" تو اتنی اچھی ہے کہ پڑھتے ہی دل میں اتر گئی۔ اس کے علاوہ "صحراؤں کی سرزمین" سب سے اچھی کہانی ہے۔ ہم یہ رسالہ ہر ماہ پڑھتے ہیں۔ انکل مہربانی کر کے یہ رسالہ تھوڑا جلدی بھیجا کریں۔ (الطاف حسین' خان پور)

☆ بیٹے! ہماری ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ تعلیم و تربیت آپ تک جلدی اور بروقت پہنچے۔ خط لکھنے کا بے حد شکریہ۔

اس دفعہ سرورق بہت خوبصورت تھا۔ تمام کہانیاں معیاری اور دلچسپ تھیں۔ کیا تعلیم و تربیت کا سالانہ خریدار بننے کے لیے دیا گیا فارم بھیجنا ضروری ہے؟ (قراۃ العین ملتان)

☆ جی ہاں! اگر آپ اپنے طور پر سال بھر کے لیے "تعلیم و تربیت" بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک منگوانا چاہتی ہیں تو شمارے میں دیا گیا فارم پر کر کے بھیجنا اور اس کے مطابق سالانہ رکنیت کی فیس ادا کرنا ضروری ہے۔

رسالہ بہت اچھا ہے۔ ہم ہر ماہ خریدتے ہیں مگر آتا دیر سے ہے۔ مہربانی کر کے یہ رسالہ جلدی بھیجا کریں۔ ہمیں اس رسالے میں کرکٹ ورلڈ کپ بہت اچھا لگا۔ اس کے علاوہ سب کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ (جلیل احمد' خانپور)

میں نہم جماعت کی طالبہ ہوں اور کئی سالوں سے آپ کا رسالہ پڑھتی آرہی ہوں۔ یہ میرا آپ کی طرف پہلا خط ہے۔ مجھے آپ کا رسالہ بے حد پسند ہے۔ اس رسالے کو اور بہتر کرنے کے لیے میں آپ کو چند مشورے دینا پسند کروں گی۔ آپ اپنے رسالے میں بچوں کے لیے کچھ مزے مزے کے کارٹونز بھی شامل کیا کریں۔ اس کے علاوہ انگلش خطوط بھی شائع کیا کریں۔ (لبیقہ بنتِ اکرم' پشاور)

☆ ہمیں خوشی ہوئی کہ "تعلیم و تربیت" آپ کو پسند ہے اور آپ اسے بڑے شوق سے پڑھتی ہیں۔ آپ کی رائے نوٹ کر لی گئی ہے۔ ہاں! البتہ کارٹون تو ہم پہلے ہی کارٹون کہانی کے طور پر شامل کر رہے ہیں۔ یقیناً آپ کو اچھے لگتے ہوں گے۔ خط لکھنے کا بہت بہت شکریہ۔

فروری 2003ء کا رسالہ ملا۔ رسالہ اتنا اچھا تھا کہ میرے لیے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ رسالے میں مجھے سب سے زیادہ روبوٹ کہانی اچھی لگی۔ اس کے علاوہ چیونٹی کہانی پڑھنے کا بہت مزہ آیا۔ تعلیم و تربیت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ لیکن مجھے یہ بات بری لگتی ہے کہ بچوں کی دلی خواہش پوری نہیں کی جاتی۔ اگر دوسروں کی نہیں تو بس ایک ہی بچے کی دلی خواہش پوری کر دیں۔ انکل پلیز میرا خط ضرور شائع کیجیے گا۔ (مشیدہ راٹھور' لاہور)

☆ لیجئے آپ کا خط شائع ہو گیا۔ اب تو آپ خوش ہیں نا!

فروری کا تعلیم و تربیت بہت پسند آیا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ تاہم یہ کہانیاں زیادہ اچھی لگیں: ایک تھا چنوں' روبوٹ کہانی' میں اس کا بندہ بنوں گا' چیونٹی کہانی اور واہ جی واہ۔ نظموں میں "کشمیر" بہت اچھی تھی۔ مجھے یہ رسالہ بہت اچھا لگتا ہے اور قسط وار کہانیاں صحراؤں کی سرزمین اور نیٹ ورک بھی بہت اچھی جا رہی ہیں۔ معلوماتی سلسلے بھی اچھے ہوتے ہیں۔ (مریم حسنات بگوی اسلام آباد)

پیارے انکل! میں آپ کا رسالہ تعلیم و تربیت بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس دفعہ کہانیوں میں "ایک تھا چنوں" چیونٹی کہانی اور ایک کہانی بہادری کی قابلِ تعریف کہانیاں ہیں اور نظموں میں ورلڈ کپ کی دنیا زبردست نظم تھی۔ (عافیہ خان ڈی آئی خان)

کارٹون کہانی

نرالے میاں کی نرالی دکان

شاہد ریاض شاہد

پھر گنجو میاں نرالے میاں کو لے کر بچے کے پاس آئے اور اُسے پیار کرتے ہوئے بولے:

بچو! پھر کیا تھا۔ نرالے میاں گردن کے گرد کپڑا لپیٹ کر کرسی پر بیٹھ گئے اور گنجو میاں قینچی سے لگے ان کی حجامت بنانے......

گنجو میاں نرالے میاں کی حجامت بناتے رہے اور اس دوران بچے سے مزے مزے کی باتیں بھی کرتے رہے۔

کچھ ہی دیر بعد نرالے میاں نے آئینہ دیکھا تو سر پیٹ کر رہ گئے۔ اب تو بال نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی ان کے سر پر۔ بچے نے دیکھا تو فوراً دوڑ لگا دی۔

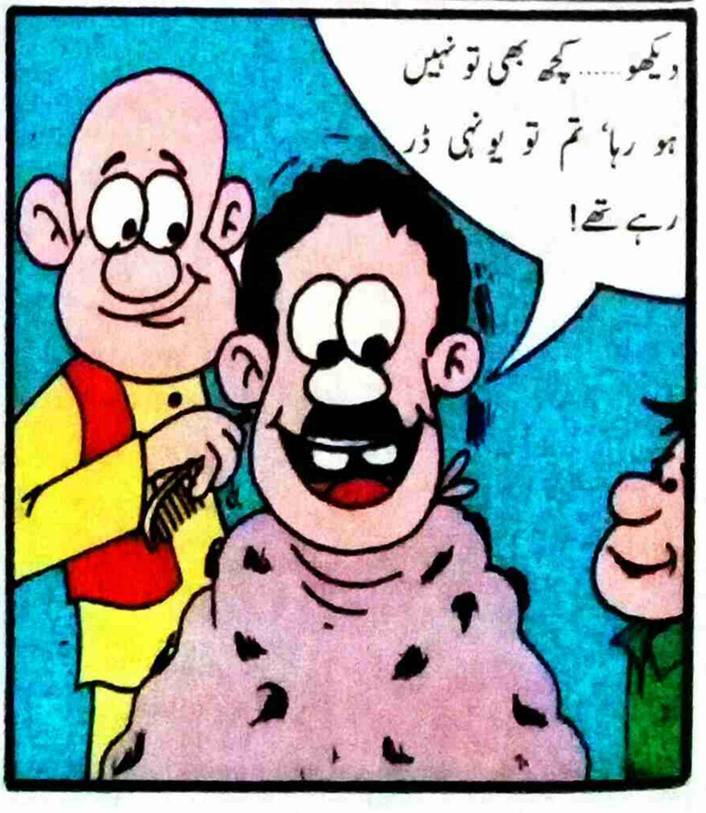

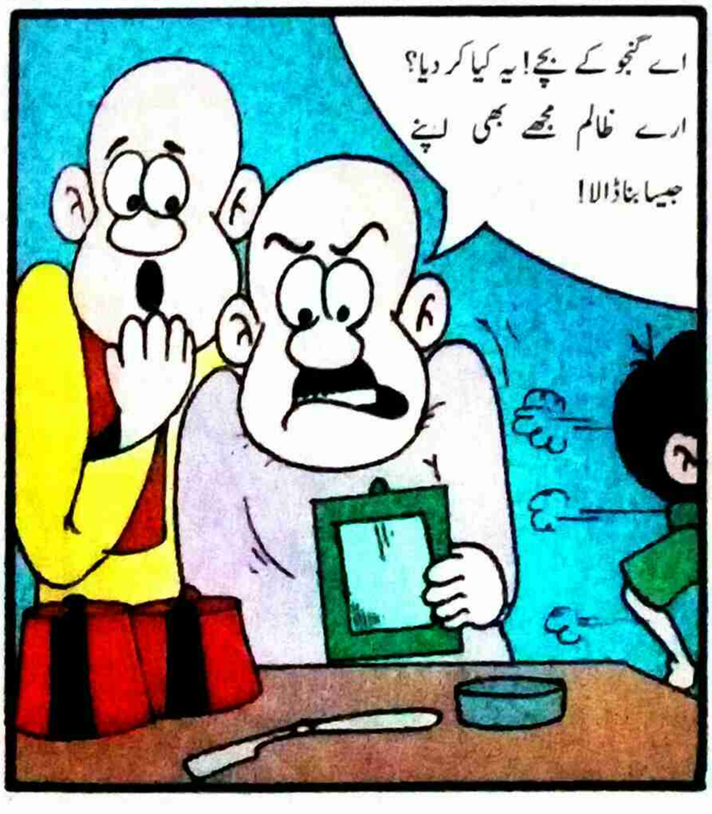

شرارتی لکیریں
شاہد ریاض شاہد
بیٹا جی! ذرا ریموٹ کا بٹن دبانا۔ میں جلد آفس پہنچنا چاہتا ہوں!
آہاہا! ہمارا جھولا آسمان کی بلندیوں پر!
بلا عنوان
آؤ بچو! تمہیں "شرارتی لکیریں" دکھاؤں!
تعلیم و تربیت

بیگم صاحبہ (نوکرانی سے): جب میں نے گھنٹی بجائی تو تم کیوں نہ آئیں؟

نوکرانی: بیگم صاحبہ! میں نے سنی نہیں تھی۔

بیگم صاحبہ (غصے سے) خبردار آئندہ جب کبھی میں گھنٹی بجاؤں اور تم نہ سنو تو فوراً آکر مجھے بتانا۔

(عاتکہ صفدر، پھالیہ)

بیٹا: ابو جی! ساتھ والے انکل اپنے بیٹے کو چاند یا تارا کہہ کر پکارتے ہیں۔ جب کہ آپ مجھے الو یا گدھا کہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

باپ: بیٹا! وہ ماہر فلکیات ہیں۔ جب کہ میں جانوروں کا ڈاکٹر ہوں۔

(شفیق احمد سیالکوٹ)

ملازمت کے ایک امیدوار سے انٹرویو لیا جا رہا تھا۔ اُس سے سوال کیا گیا۔

"سورج زمین سے کتنا دور ہے"۔

"صحیح فاصلہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن وہ اتنا قریب نہیں ہے کہ میرے معاملات میں مداخلت کر سکے"۔

(نصر اللہ خان سیفی، خوشاب)

ایک شخص جب بھی کسی سے ٹکراتا تو کہتا: گدھے کہیں کے۔ ایک دفعہ وہ اپنے خیالوں میں مگن کہیں جا رہا تھا کہ اس کی ٹکر ایک گدھے کے ساتھ ہو گئی۔ وہ تھوڑی دیر چپ رہا پھر بولا: میں آپ کو کیا کہوں آپ تو آپ ہی ہیں۔

(ارحم اقبال اسلام آباد)

راہ گیر: ارے تم سارا دن بھیک مانگتے ہو اور اب رات کو بھی بھیک مانگ رہے ہو شرم نہیں آتی۔

بھکاری: جناب یہ مہنگائی کا زمانہ ہے دن رات محنت کرنی پڑتی ہے۔

(عتیق الرحمان، گجرات)

ایک پریشان حال پروفیسر شناختی کارڈ کے دفتر میں کارڈ بنوا رہے تھے کہ ان سے شناختی علامت پوچھی گئی۔ انہوں نے جواب دیا "لکھ دیں کہ پیشانی پر پریشانی کے آثار ہیں"۔

(نیلم احمد، جھنگ صدر)

ایک آدمی دوسرے سے: تم گدھے ہو۔

دوسرا: تم گدھے کے باپ ہو۔

تیسرا آدمی: چلو اچھا ہوا باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔

(ماہم ارشاد لاہور)

ایک دوست (دوسرے سے): اگر دنیا میں پانی نہ ہوتا تو؟

دوسرا: پھر دودھ خالص ہوتا۔

(اسامہ احمد، گجرات)

شوہر (بیوی سے): "دیکھو بیگم، منے نے میرا تازہ افسانہ پھاڑ دیا ہے؟"

بیوی (خوشی سے): "ماشاء اللہ میرا منا پیدائشی نقاد ہے"۔

(فارحہ زعفران، ڈیرہ غازی خان)

مالک: (نوکر سے) "اگر کوئی گاہک آئے اور کچھ مانگے تو ادب سے تعمیل کرنا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں"۔

کچھ دیر بعد مالک واپس آیا اور پوچھا۔ "کوئی آیا تھا؟"

نوکر: "جی ایک آدمی ہاتھ میں پستول پکڑے آیا اور نقدی طلب کی تو میں نے نہایت اخلاق سے اس کی تعمیل کی"۔

(سحر منیر، فیصل آباد)

حیران کن

سید شوکت اعجاز

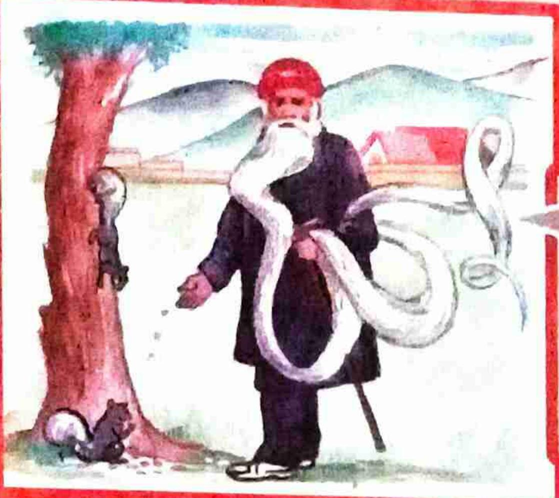

کمال ہے!

دنیا میں سب سے لمبی داڑھی ناروے کے ایک باشندے ہانس لینگسٹھ نے بڑھائی تھی۔ اُس نے 1927ء میں وفات پائی اُس وقت اس کی داڑھی کے بال ساڑھے سترہ فٹ لمبے تھے۔ اس کی داڑھی آج بھی امریکا کے ایک عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

ہمت مرداں!

1942ء کا واقعہ ہے کہ ہانگ کانگ کے ایک ملاح پون لم نے، جس کا بحری جہاز بحرِ اوقیانوس میں ساحل سے تقریباً 600 میل دور ڈوب گیا تھا، بے سروسامانی کے عالم میں لکڑی کی کشتی پر پورے 133 دن گزارے یعنی ساڑھے چار مہینے۔ بالآخر ایک ماہی گیر کشتی نے اس کی جان بچائی۔

بھاری بھرکم برفانی ریچھ

دنیا کا سب سے زیادہ بھاری بھرکم برفانی ریچھ 1960ء میں شکاریوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ساڑھے گیارہ فٹ لمبے اس ریچھ کا وزن 2210 پونڈ تھا۔ واضح رہے کہ عام طور پر برفانی ریچھ کا وزن ساڑھے آٹھ سو پونڈ تک ہوتا ہے اور لمبائی تقریباً ساڑھے سات فٹ ہوتی ہے۔

ایک ہی جست میں!

1892ء میں برطانیہ کے جوڈاربی نامی ایک شخص نے 12 فٹ لمبی بلیرڈ کھیلنے والی میز کو پھلانگنے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ اس نے 4 انچ چوڑے لکڑی کے تختے پر کھڑے ہو کر ایک ہی جست میں میز کو پار کر لیا۔

مجرم کون؟

ہر حل کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے۔ جواب پہنچنے کی آخری تاریخ 10 مارچ 2003ء

مجرم کون؟

نام: ______________________

پورا پتا: ______________________

____

____

مجرم کا کھوج لگائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

ایک روز انسپکٹر زاہد موسیقی کا ایک شو دیکھ رہے تھے۔ وہاں ایک عورت کا قیمتی ہار چوری ہو گیا۔ عورت کو بانسری بجانے والے پر شک تھا۔ انسپکٹر زاہد نے اس کی پوری تلاشی لی مگر کچھ برآمد نہ ہوا۔ اچانک انہیں کچھ خیال آیا اور انہوں نے اُس فنکار کو بانسری بجانے کے لیے کہا۔ جونہی اس نے بانسری بجانی شروع کی انسپکٹر نے اُسے گرفتار کر کے اس سے چوری شدہ ہار برآمد کر لیا۔ انسپکٹر زاہد کو کس طرح پتا چلا؟ ذرا سوچ کر بتایئے!

فروری 2003ء میں شائع ہونے والے "مجرم کون؟" کا صحیح حل: انسپکٹر زاہد ادھر ادھر کمرے کے فرش پر چپس گرا دیں گے۔ چور جس طرف بھی جائے گا، چپس کی وجہ سے اس کے قدموں کی آواز آئے گی۔ یوں سخت اندھیرا ہونے کے باوجود انہیں چور کی پوزیشن کا اندازہ ہو جائے گا اور وہ آسانی سے اس کا نشانہ لے سکیں گے۔

یہ جواب ہمیں 1721 بچوں نے ارسال کیا، جن میں سے 10 بچے بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار ٹھہرے۔ ان ساتھیوں کو 50، 50 روپے کی کتابیں دی جا رہی ہیں۔

(1) محمد عمیر خان، اسلام آباد (2) ناصر حسین، ٹھٹھہ (3) وردہ احمد، فیصل آباد (4) توقیر احمد، سکھر (5) زاہد منیر، خان پور (6) محمد ابوبکر حافظ آباد (7) ثوبان احمد، ڈیرہ غازی خان (8) صفیہ مصباح، کالا گوجراں (9) شرجیل جاوید، کراچی (10) ثوبیہ جمال، لاہور۔

آپ بھی لکھیے

ایثار

طیبہ الطاف، کھاریاں

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مسجد نبوی میں ایک شخص آیا جو بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اس نے رسول پاک ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے کھانے کے لیے کچھ دیا جائے۔ اتفاق سے اس روز آپؐ کے گھر میں کھانے کے لیے کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے کہا کہ کوئی صاحب مہمانی کے لیے اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔ ایک انصاری حضرت ابو طلحہؓ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کے یہاں صرف ایک آدمی کا کھانا تھا جو بمشکل بچوں کے لیے پورا ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ بچوں کو کسی طرح بہلا کر سلا دو اور جب مہمان کے لیے کھانا لگاؤ تو چراغ ٹھیک کرنے کے بہانے اٹھ کر بجھا دینا۔ خود کھانا نہ کھانا البتہ ظاہر یہ کرنا کہ ہم لوگ بھی کھانے میں شریک ہیں تاکہ مہمان اطمینان سے کھانا کھا لے۔ چنانچہ ان کی بیوی نے ایسا ہی کیا۔ دوسرے روز جب حضرت ابو طلحہؓ مسجد نبوی میں حاضر ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں خوشخبری سنائی کہ: اللہ تعالیٰ نے تمہاری اس بات کو بہت پسند فرمایا ہے۔

پیارے بچو! آیئے ہم بھی عہد کریں کہ خلوص و ایثار کی ان روایات کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ انشاء اللہ!

(پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

تعلیم کا زیور

راشد حسن خان، فیصل آباد

فائزہ ایک ذہین لڑکی تھی مگر اُس کے ماں باپ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ وہ سکول میں ہمیشہ اعلیٰ پوزیشن حاصل کرتی تھی مگر افسوس کہ آٹھویں جماعت سے ہی اس کے ماں باپ نے اسے سکول سے اٹھوا لیا۔

اس طرح فائزہ آگے نہ پڑھ سکی اور جلد ہی اس کی شادی کر دی گئی۔ اس کا شوہر بہت بد سلیقہ، اجڈ اور غیر مہذب تھا۔ فائزہ کو اللہ نے دو بیٹیاں عطا کیں۔ اس کا شوہر ہر وقت اُسے بیٹیوں کی وجہ سے طعنے دیتا رہتا تھا۔ جب تک ساس اور سسر زندہ رہے اُس وقت تک تو گزر بسر ہوتی رہی مگر اُن کے بعد اُس کے شوہر نے اُسے اپنی بیٹیوں سمیت گھر سے نکال باہر کیا۔ وہ شہر کے ایک غریب علاقے میں کرائے کے مکان میں رہنے لگی۔ اب فائزہ کو گھر گھر جا کر کام کرنا پڑتا تھا۔ دن رات کی سخت محنت کے باوجود گزر بسر بہت مشکل سے ہوتی تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد اس کے محلے میں ایک پرائیوٹ سکول کھلا۔ ایک دن وہاں سے ایک اُستانی فائزہ کے گھر میں آئی۔ دراصل سکول والوں کو چند اُستانیوں کی ضرورت تھی اور پرنسپل کے حکم کے مطابق وہ گھر گھر جا کر پتا کر رہی تھی کہ اگر کوئی چاہے تو اُسے سکول میں استانی کی نوکری مل سکتی ہے۔ جب فائزہ نے اُسے بتایا کہ وہ صرف مڈل پاس ہے تو وہ استانی معذرت کر کے چلی گئی۔ وہ تو چلی گئی مگر فائزہ کے زخم ہرے ہو گئے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش! اُس کے ماں باپ نے اُسے کچھ اور تعلیم دلائی ہوتی! کاش! اس کے ماں باپ کو احساس ہوتا کہ تعلیم آگے جا کر اس کے کتنے کام آ سکتی ہے۔ مگر! مگر نہیں! میں اپنے والدین کی غلطی نہیں دہراؤں گی! میں اپنی بچیوں کو ضرور پڑھاؤں گی، جو میرے ساتھ ہوا ہے وہ میں کبھی اپنی بچیوں کے ساتھ نہیں ہونے دوں گی۔

دل میں یہ فیصلہ کرتے ہی فائزہ اٹھی، چادر اوڑھی، اپنی دونوں بچیوں کو ساتھ لیا اور سکول کی طرف ایک نئے عزم کے ساتھ

روانہ ہو گئی۔

(دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

صورت نہیں سیرت

نوشین شوکت' کاموں کی

"آؤ کلو آؤ خوش آمدید!" یہ شازینہ تھی جو حوریہ کو طنز کر رہی تھی۔ دراصل حوریہ کلاس میں نئی آئی تھی۔ اس کی رنگت سانولی تھی۔ اس وجہ سے شازینہ روز اس کا دل دکھاتی اور اسے کلو کہہ کر پکارتی تھی۔ حوریہ سے اسے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شازینہ ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی جب کہ حوریہ ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ شازینہ پڑھائی میں بھی کمزور تھی جب کہ حوریہ ذہین اور لائق تھی۔ اسی وجہ سے وہ اس سے حسد کرتی تھی۔ حوریہ کو اکثر ایسے جملے سننے پڑتے تھے کہ وہ بہت اداس ہو جاتی۔ ایک دن حوریہ نے اپنی امی سے بات کی تو اس کی امی نے اسے سمجھایا کہ "دیکھو بیٹا تم اُس کی باتوں کی طرف توجہ مت دیا کرو بلکہ اپنی پڑھائی کی طرف دھیان رکھا کرو۔ اچھے لوگ اپنی صورت سے نہیں سیرت سے پہچانے جاتے ہیں"۔ اپنی امی کی یہ باتیں سن کر حوریہ کو تسلی ہوئی اور اس نے دل لگا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ آخر نتیجہ یہ نکلا کہ حوریہ ایک دن ملک کی نامور ڈاکٹر بن گئی۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ایک دفعہ شازینہ کی گاڑی تیز رفتاری کے باعث گہرے کھڈ میں جاگری۔ اس ایکسیڈنٹ میں شازینہ کی جان تو بچ گئی لیکن اس کا چہرہ بری طرح متاثر ہو گیا۔ اتفاق سے حوریہ بھی اسی ہسپتال میں ڈاکٹر کے فرائض انجام دے رہی تھی جہاں حوریہ کو زخمی حالت میں لایا گیا۔ حوریہ نے اسے پہچان لیا اور پوری توجہ سے اس کا علاج کیا۔ ہوش آنے پر شازینہ نے بھی حوریہ کو پہچان لیا۔ اُسے دیکھتے ہی شازینہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس کا سر شرمندگی سے جھک گیا۔ اس نے حوریہ سے معافی مانگی اور کہا: میری دوست مجھے معاف کر دو! میں نے ہمیشہ تمہارا دل دکھایا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ حوریہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

ساتھیو! ہمیں چاہیے کہ کبھی کسی کا دل نہ دکھائیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کو پسند نہیں کرتا جو کسی کو دکھ پہنچائے۔

(تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

گاجر کا حلوا

نوشین رباب' سیت پور

سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ امی جان نے ایک رات گاجر کا حلوا تیار کیا۔ ہوم ورک کرتے ہوئے حلوے کی خوشبو فوراً ہی ہمارے ان دو نتھنوں سے ٹکرا گئی جنہیں عرف عام میں امی جان "ملی کے نتھنے" کہا کرتی ہیں۔ بھینی بھینی خوشبو سے ہمارا دماغ معطر ہو گیا۔ ہم فوراً اٹھے اور کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ امی جان گاجر کے حلوے کو فریج میں "قید" کر کے باورچی خانے سے باہر نکل رہی تھیں۔ چابی ان کے ہاتھ میں تھی۔ ہم فوراً اپنی جگہ واپس آئے اور بستہ کھول کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں امی جان کمرے میں داخل ہوئیں اور بولیں: ارے تم ابھی تک پڑھ رہی ہو؟ اب بس کرو اور کھانا کھا لو۔ "ج...... ج...... جی امی جان!" ہم نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

ہم نے جلدی سے بیگ کو بند کیا اور کھانے کے لیے تشریف لے گئے۔ مگر ہمارا دل تو حلوے میں اٹکا ہوا تھا۔ سونے کے لیے اپنے کمرے میں آتو گئے مگر نیند کہاں...... ! آدھی رات کے وقت ہم چوروں کی طرح اٹھے اور بزدلوں کی طرح دبے پاؤں باہر نکل آئے۔ سب آرام کر رہے تھے۔ ہم آہستہ سے امی جان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ چپکے سے دراز میں سے چابیاں اٹھائیں اور باورچی خانے کا دروازہ کھول کر لائٹ جلائی۔ فریج کھولی تو سامنے ہی گاجر کے حلوے کی ڈش رونق افروز تھی۔ ہم نے ندیدوں کی طرح اسے دونوں ہاتھوں سے تھاما اور اطمینان سے گاجر کا حلوہ کھانے لگے۔ جی بھر کر کھایا۔ ابھی ڈش خالی ہی ہوئی تھی کہ پیچھے سے امی جان کی آواز سنائی دی......

اس کے بعد ہمارے ساتھ جو سلوک امی جان نے کیا ہم سے نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے!

(چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

وعدہ پورا کریں

عبدالصمد گبول' راجن پور

"حامد تم نماز کیوں نہیں پڑھتے؟" دادا ابو نے حامد سے کہا۔ "دادا ابو میں صبح کی نماز ضرور پڑھوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے" حامد نے جواب دیا۔

جب صبح کا وقت ہوا تو حامد غفلت کی نیند سوتا رہا اور جب بیدار ہوا تو سکول کا ٹائم ہو چکا تھا۔ اس لیے بغیر نماز پڑھے سکول چلا گیا"۔

حامد جب سکول سے واپس آیا تو دادا جان نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا: بیٹا کل تم نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ صبح کی نماز ضرور پڑھوں گا۔ تم نے وعدہ پورا نہیں کیا۔ دیکھو بیٹا اول تو وعدہ کیا نہ کرو اگر کرو تو اسے ضرور پورا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: "وعدہ پورا کیا کرو قیامت کے دن وعدے کے بارے میں پوچھا جائے گا"۔

تھوڑی دیر دادا چپ رہے پھر بولے: ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کا فرمان ہے کہ "جو اپنے وعدے اور قول و قرار کا خیال نہیں رکھتا اس میں دین نہیں ہے"۔ بیٹا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وعدے کی پابندی دیانت داری کی علامت ہے اور جو شخص اپنے وعدے کو پورا نہیں کرتا وہ دین کی روح اور اُس کی خیر و برکت سے محروم رہتا ہے۔ (پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

سانچ کو آنچ نہیں

عزیز اللہ سید سورانی' ٹل

مجھے بچپن سے سائنس دان بننے کا شوق تھا۔ یہ شوق مجھے اس لیے بھی تھا کہ میں جانتا تھا کہ سائنسدانوں کو ہمیشہ سچ یعنی حقیقت کی تلاش ہوتی ہے۔

اس لیے میں نے دل میں یہ عہد کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو میں ہمیشہ سچ بولوں گا۔ مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ کہنے اور عمل کرنے میں کتنا فرق ہوتا ہے۔

میں دسویں جماعت میں تھا کہ ایک روز میں اور میرے دو دوست لیبارٹری میں پریکٹیکل کر رہے تھے۔ میرے قریب ہی پارے سے بھرا ہوا بیکر تھا۔ میں نے بیکر اٹھانا چاہا تو وہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اتفاق سے اس وقت وہاں ہمارے استاد موجود نہیں تھے۔ سب نے کہا کہ جلدی سے اٹھا کر چھپا دو ورنہ شامت آجائے گی۔ میں نے بڑی مشکل سے تھوڑا بہت پارا اٹھایا اور دوسرے خالی بیکر میں ڈالا اور ٹوٹا ہوا بیکر ڈبے میں پھینک دیا۔ دوسرے دن ہمارے استاد نے پوچھا کہ بیکر کس نے توڑا ہے تو میں نے انہیں سچ سچ بتا دیا۔ جب انہیں پتا چلا تو کافی دیر تک مجھے ڈانٹتے رہے۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ تم کل تک اس پارے کی قیمت ادا کر دو ورنہ میں تمہیں ایڈمٹ کارڈ نہیں دوں گا!

پورا دن میں بہت پریشان رہا کہ کل سکول میں اپنے استاد کو کیا جواب دوں گا۔ خیر دوسرے دن سکول گیا تو میں بہت ہی اداس اور شرمندہ تھا۔ میں اپنے استاد سے نظریں بھی نہیں ملا رہا تھا۔ کلاس کے بعد انہوں نے مجھے اسٹاف روم میں بلایا اور کہنے لگے کہ: "میں تمہیں جانتا ہوں کہ تم ایک اچھے طالب علم ہو۔ تم نے ہمیشہ اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا ہے اور سچ بولا ہے۔ تمہارا سچ بولنا اور غلطی کا اعتراف کر لینا مجھے اچھا لگا۔ جاؤ خوب دل لگا کر پڑھو اور کامیابی حاصل کرو۔ کسی کی پرواہ کیے بغیر آئندہ بھی ہمیشہ سچ بولنا!" مجھے اپنے مہربان استاد کی اس بات سے بے حد خوشی ہوئی اور پورا یقین ہو گیا کہ واقعی "سانچ کو آنچ نہیں"

(چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

ضروری بات

ازراہ کرم تحریریں بھیجتے وقت ان باتوں کا ضرور خیال رکھیں:

☆ تحریر صاف' خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف لکھی ہوئی ہو۔

☆ اپنا پورا نام اور پتا ضرور لکھا کریں۔

ننھے منوں کے لیے

ڈوڈو اور ڈڈی

معروف احمد چشتی

ایک تھا سبز پانی کا جوہڑ اور اس جوہڑ میں رہتے تھے بہت سے مینڈک۔ چھوٹے بڑے، موٹے، پتلے۔ ہر قسم کے بڑے مینڈک صبح شام ٹرٹرانے کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ جو مینڈک سب سے زیادہ اونچی آواز میں ٹرٹراتا وہ جیت جاتا جب کہ چھوٹے مینڈک پڑھا کرتے تھے۔ جوہڑ کے کنارے نرم نرم گھاس پر ان کا سکول لگتا تھا جہاں ان کی ٹیچر انہیں پڑھاتی تھیں۔

ایک دن کیا ہوا کہ سکول لگ چکا تھا، سارے مینڈک بچے کلاس میں آچکے تھے مگر ابھی ان کی ٹیچر کلاس میں نہیں تھیں اس لیے سب بچے آپس میں باتیں کر کے خوب شور مچا رہے تھے۔ مانیٹر ان کو خاموش کرانے کی کوشش کر رہا تھا مگر بچے اس کی سن ہی نہیں رہے تھے۔

اچانک کیا ہوا کہ کلاس کے بیچوں بیچ نرم نرم زمین پر اوپر سے ایک مینڈک آگرا۔

"یہ کیا؟" کئی بچوں نے چیخ کر کہا۔

گرنے والا مینڈک بھی کلاس کے بچوں کی طرح چھوٹا سا تھا مگر اس کا رنگ ذرا کالا تھا۔

چند بچے شور مچانے لگے۔ "کالا مینڈک کالا مینڈک"۔

ایک بچے نے کہا۔ "کالا کلوٹا کالا کلوٹا"۔

سارے بچے نئے مینڈک کو تنگ کرنے لگے۔ نیا مینڈک بیچارا بہت گھبرا رہا تھا۔ اس کی تو سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ بڑا پریشان ہوا۔ لگ رہا تھا کہ ابھی رو پڑے گا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر کلاس کے ایک بچے ڈوڈو کو احساس ہوا کہ اسے نئے مینڈک کی مدد کرنی چاہیے۔

ڈوڈو نے ساتھ بیٹھے اپنے ایک دوست سے کہا: "دیکھو، وہ بیچارا کتنا گھبرا رہا ہے۔ لڑکوں کو چاہیے کہ اسے تنگ نہ کریں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر اس کی جگہ میں یا تم ہوتے تو ہم کتنے پریشان ہوتے۔ افوہ! لڑکے کتنا برا کام کر رہے ہیں۔ آؤ ہم اس کی مدد کرتے ہیں"۔

پھر ڈوڈو اور اس کا دوست نئے مینڈک کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے اور کلاس کے بچوں سے کہنے لگے۔ "دیکھیں' آپ لوگ اسے تنگ نہ کریں یہ بھی ہمارا بھائی ہے۔ آپ سوچیں کہ اگر آپ کسی نئی جگہ پر جائیں اور لوگ آپ کا مذاق اڑائیں تو آپ کو کتنا برا لگے گا۔ لگے گا ناں؟"

"ہاں' یہ تو ہے۔ ہمیں بہت برا لگے گا"۔ ایک مینڈک بچے نے جواب دیا۔

ڈوڈو پھر کہنے لگا "تو پھر آپ اس کا مذاق نہ اڑائیں بلکہ اس کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کریں۔ نجانے یہ کیسے یہاں آ پہنچا ہے اور اس کے رنگ کا مذاق بھی نہ اڑائیں۔ رنگ تو اللہ میاں بناتے ہیں۔ اگر ہم اس کے رنگ کا مذاق اڑائیں گے تو اللہ میاں ناراض ہو جائیں گے کہ میری بنائی ہوئی چیز کا مذاق اڑاتے ہو"۔

یہ کہہ کر ڈوڈو نئے مینڈک کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ بچے اس کو تنگ نہیں کریں گے۔ پھر اس نے نئے مینڈک سے کہا کہ اس کا نام کیا ہے اور وہ کہاں سے آیا ہے؟

نئے مینڈک نے جواب دیا۔ "میرا نام ڈڈی ہے۔ میں یہاں سے کچھ دور ایک دوسرے گاؤں میں رہتا ہوں۔ ہمارے ہاں سکول نہیں ہے۔ میں نے سنا تھا کہ سکول میں بچے اچھی اچھی کتابیں پڑھتے ہیں اور صاف ستھرے رہتے ہیں۔ اس لیے مجھے آپ لوگوں سے ملنے کا شوق ہوا اور میں نے ایک بگلے سے کہا کہ وہ مجھے اپنی چونچ میں اٹھا کر سکول چھوڑ آئے۔ اس طرح میں یہاں پہنچ گیا۔ مجھے آپ کے سکول کے بارے میں بھی بگلے نے ہی بتایا تھا اور جہاں تک میرے رنگ کا تعلق ہے اس کے لیے میں آج بہت شرمندہ ہوا ہوں کیوں کہ میں ہر وقت کیچڑ میں کھیلتا رہتا ہوں اور بہت کم نہاتا ہوں اس لیے میرا رنگ سیاہ ہو گیا ہے"۔

ڈوڈو نے پوچھا۔ "ڈڈی بھیا! آپ کو ہم سے ملنے کا شوق تھا تو آپ نے ہمیں کیسا پایا؟"

ڈڈی نے جواب دیا؟ "پہلے پہل تو میں گھبرایا تھا مگر آپ دونوں دوستوں نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے۔ اگر آپ ان بچوں کو منع نہ کرتے تو میں سمجھتا کہ شاید سکول کے بچے اسی طرح بدتمیز اور مذاق اڑانے والے ہوتے ہیں۔ مگر اب میں واپس جا کر اپنے دوستوں کو بتاؤں گا کہ آپ لوگ بہت اچھے ہیں۔ آپ دوسروں کا خیال رکھتے ہیں"۔

"تالیاں" ڈوڈو کے دوست اپنی تعریف سن کر تالیاں بجانے لگے۔

پھر کچھ دیر کے بعد ڈڈی کا دوست بگلا اسے لینے آگیا اور وہ سب دوستوں کو خداحافظ کہہ کر گھر روانہ ہو گیا مگر جانے سے پہلے ڈڈی نے اپنے نئے دوستوں سے وعدہ کیا کہ اب وہ باقاعدگی سے نہایا کرے گا صاف ستھرا رہے گا اور جلدی سکول میں بھی داخلہ لے لے گا۔

☆☆☆

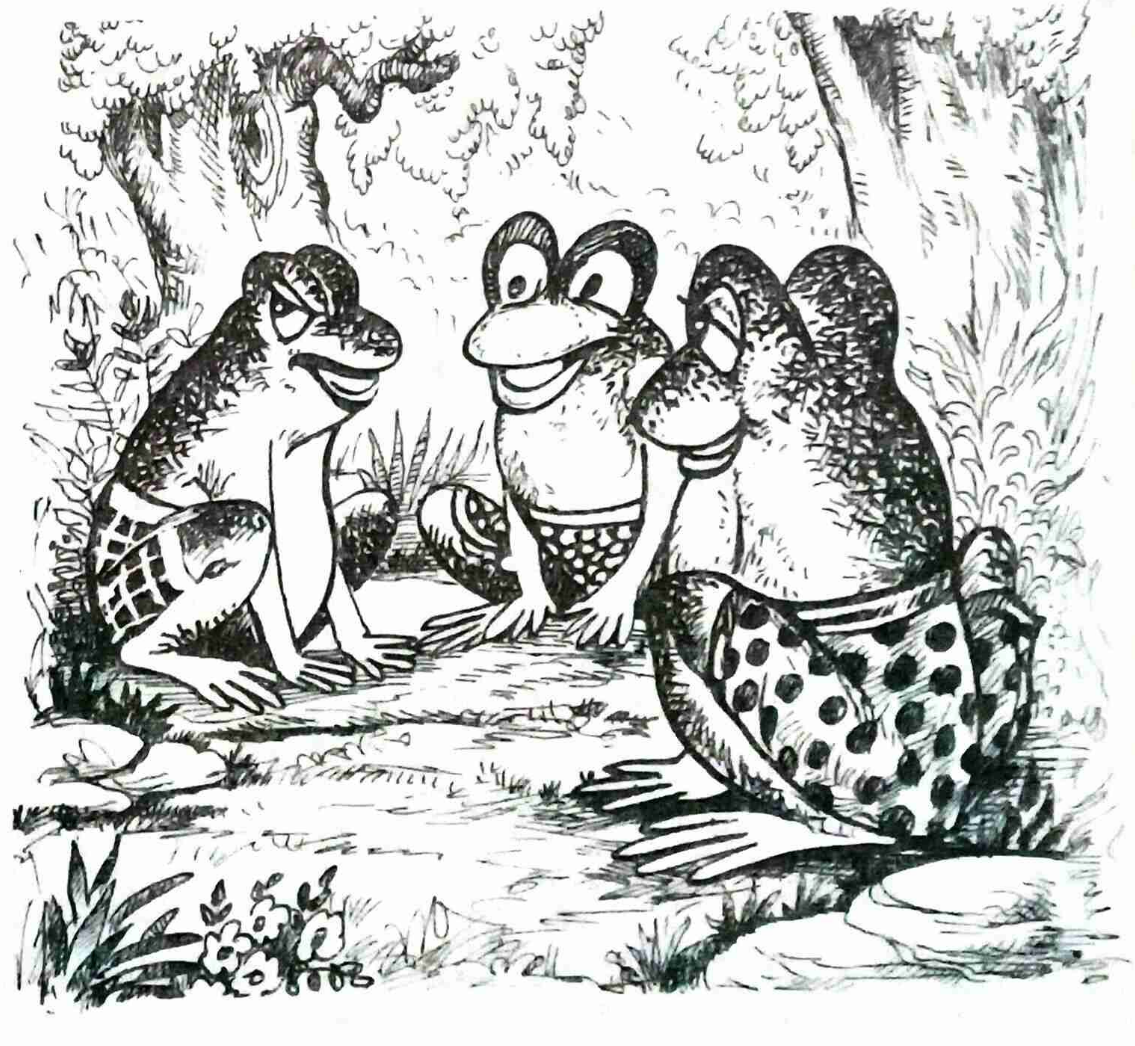

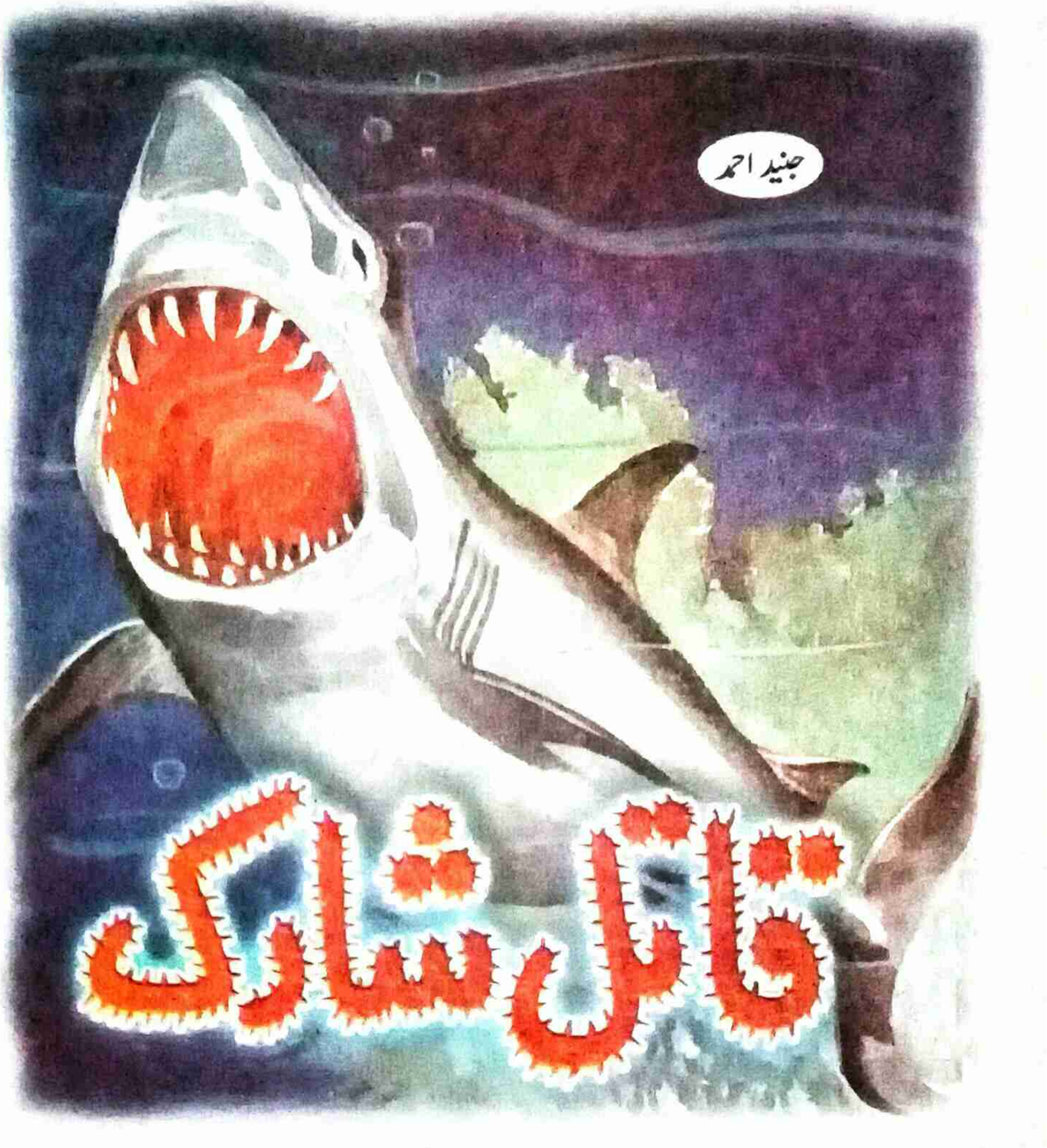

شارک مچھلی کا نام سنتے ہی ذہن ایک خونخوار' تیز دانتوں والی مچھلی کی طرف جاتا ہے جو کھلے پانیوں میں انسان کی سب سے بڑی دشمن سمجھی جاتی ہے۔ یہ بات بڑی حد تک درست بھی ہے یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی تیراک یا غوطہ خور اس کی موجودگی میں اُس سے بچ نکلے۔ سمندر میں گرنے والے بدنصیب مسافروں کو یہ اس وقت سے نوالہ بنا رہی ہے جب سے انسان نے سمندر میں سفر شروع کیا ہے۔

شارک مچھلی کی 250 اقسام ہیں۔ یہ مچھلی دنیا کے تمام سمندروں میں پائی جاتی ہے۔ اس کی زیادہ تعداد گرم پانیوں میں ملتی ہے۔ قسموں کے لحاظ سے مختلف ہونے کے علاوہ اس کے سائز بھی الگ الگ ہیں۔ اس کی ایک قسم صرف 6 سے 8 انچ تک لمبی ہوتی ہے جب کہ سب سے بڑی قسم وائٹ شارک کی لمبائی 60 فٹ تک ریکارڈ کی گئی ہے۔

شارک کی پانچ اقسام انسان کی سب سے بڑی دشمن ہیں۔ ٹائیگر شارک' لیمن شارک' ہیمر ہیڈڈ شارک' میکو شارک اور سب سے خطرناک وائٹ شارک۔ ہماری آج کی کہانی کا (جو شکاریات کے حوالے سے ایک سچے مگر ہولناک واقعہ پر مشتمل ہے) مرکزی کردار یہی وائٹ شارک ہے۔

ایڈفڈ آلٹر نامی ایک مشہور غوطہ خور کو ایک دفعہ جاپان کے ساحل پر وائٹ شارک سے واسطہ پڑا تھا۔ یہ واقعہ انہی کی زبانی سنیے!

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اپنی بحری مہمات سے تھک کر آرام کرنے کے موڈ میں تھا کہ میری ملاقات مشہور و معروف فوٹو گرافر رکی سے ہوئی۔ رکی زیر آب فلمیں بنانے کا ماہر تھا۔ اس نے کئی دستاویزی اور فیچر فلموں کے لیے زیر آب فوٹو گرافی اور فلم میکنگ کی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ کچھ دنوں تک جاپان کے پاس ایک جزیرے "ایلاتی" جا رہا ہے جہاں اس کا پروگرام سیپ اکٹھے کرنے والوں کے بارے میں فلم بنانے کا ہے۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ میں نے فوراً حامی بھرلی۔

ضروری تیاری کے بعد ہم جاپان کے لیے روانہ ہو گئے۔ دو تین روز آرام کے بعد ہم ایک بحری جہاز کے ذریعے ایلاتی کے جزیرے پر پہنچ گئے۔ اس جزیرے کے لوگ سیپ اکٹھے کر کے اپنا گزارہ کرتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ان دنوں سیپ اکٹھے کرنے کے سیزن کا آغاز تھا۔ ہم دونوں بھی ایسی ہی ایک مہم میں شامل ہو گئے۔

ایک چمکیلی صبح کو میں رکی اور چار مقامی نوجوان ایک لانچ میں بیٹھ کر کھلے سمندر کی طرف روانہ ہوئے۔ رکی نے اپنا کیمرہ تیار رکھا ہوا تھا۔ ہمارے چار ساتھیوں میں سے تین نے ہمارے ساتھ سمندر میں غوطہ لگا کر سیپ اکٹھے کرنے تھے اور ایک نے لانچ میں رہنا تھا۔ ہم سب نے غوطہ خوری کے لباس پہن رکھے تھے۔ نوجوانوں کے پاس تیز چھرے تھے جن سے انہوں نے سیپ کے ریشے کاٹ کر انہیں اکٹھا کرنا تھا۔ میرے پاس ایک جدید واٹر گن تھی۔ ایک نوجوان نے مجھے اپنے سامان میں سے نکال کر ایک چھرا دیا اور کہا کہ یہ میرے کام آئے گا۔ میں نے ہنس کر کہا کہ اس کے لیے شکریہ مگر میرے لیے یہ گن ہی کافی ہے۔ بہر حال میں نے اپنے کیمرے سے چھرے کو لٹکا لیا۔ ہم نے اکٹھے سمندر میں غوطہ لگایا۔ اس جگہ سمندر کی گہرائی صرف 100 فٹ تھی اور سورج کی روشنی ہلکی ہلکی تہہ تک پہنچ رہی تھی۔ سمندر کی سطح کے ساتھ ساتھ تہہ بھی بہت پر سکون تھی۔ رنگ برنگی مچھلیاں اور پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ ہم ان لڑکوں کے پیچھے پیچھے آگے کی طرف بڑھے۔ ایک جگہ انہیں چٹانوں پر بہت سے سیپ نظر آئے۔ ہمیں اشارے سے روک کر انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ رکی نے فلم بنانی شروع کر دی۔

یہ نوجوان جن چٹانوں پر سے سیپ کاٹ رہے تھے ان کے اوپر ایک بہت بڑا غار تھا جس کے منہ پر نہایت خوبصورت نیلی پیلی مچھلیاں اوپر نیچے حرکت کر رہی تھیں۔ یہ نظارہ بہت ہی پیارا تھا۔ میں نے رکی کو اشارہ کیا کہ اس منظر کو بھی محفوظ کرے۔ اس نے کیمرے کا رخ اس طرف موڑ دیا۔ میں لڑکوں کی طرف پوری طرح متوجہ تھا کہ اچانک میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کیا۔ میں نے سیدھا غار کی طرف دیکھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے غار کے منہ پر رقص کرتی مچھلیاں غائب ہوگئیں۔

اُف میرے خدا ایک انتہائی خونخوار کھلے منہ والی سفید شارک غار سے باہر آئی۔ یہ کم از کم 50 فٹ لمبی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرنے کی کوشش کرتا اس بلا نے ان تین نوجوانوں پر حملہ کر دیا۔ چشم زدن میں پانی خون سے بھر گیا۔ مجھے اس ہلچل میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ میری گن تیار تھی مگر مجھے نشانے کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔ میں نے ہمت کی اور تیر کر آگے بڑھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک لڑکا اس بلا نے اپنے استرے جیسے تیز دانتوں سے کاٹ کر رکھ دیا ہے اور دوسرے کو منہ میں لے کر بھنبھوڑ رہی ہے۔ تیسرا مجھے نظر نہیں آیا۔ میں نے اپنی گن فائر کی۔ فائر شارک کے پیٹ میں لگا اور وہ اپنے شکار کو چھوڑ کر میری

طرف آئی۔ اسی وقت رکی اور تیسرے لڑکے نے مجھے پکڑا اور اوپر جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے انہیں ہاتھ سے پیچھے جھٹک کر دوبارہ گن چلائی مگر یہ جام ہو کر رہ گئی۔ موت بڑی تیزی سے میری طرف آرہی تھی۔ وقت بالکل نہیں تھا۔ میں تیزی سے اوپر کی طرف لپکا۔ شارک ہمارے پیچھے تھی۔ ہم اپنی پوری طاقت صرف کر کے سطح آب پر آئے اور لانچ کی طرف لپکے۔ چیخ کر لانچ والے جوان کو خبردار کیا اور لانچ پر چڑھ گئے۔ وہ لڑکا سمجھ گیا تھا کہ کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ اس نے لانچ فوراً اسٹارٹ کر دی۔ ہم زیادہ سے زیادہ ایک آدھ فرلانگ تک ہی گئے ہوں گے کہ یوں لگا کہ جیسے ہماری لانچ کو کسی نے زور دار ٹھوکر مار دی۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ سنبھلتے' دوسری ٹکر نے ہماری لانچ اُلٹا دی۔

اب صورتحال یہ تھی کہ ہم چار انسان ایک خونخوار شارک کے رحم و کرم پر تھے۔ شارک نے سب سے پہلے رکی پر حملہ کیا۔ اس بیچارے نے اپنا کیمرہ آگے کر دیا۔ کیمرے کو دانتوں سے چبا کر اس نے رکی کی ٹانگوں کو منہ میں لے لیا۔ میں نے واٹر گن کو جو ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی دور پھینکا اور پاگلوں کی طرح شارک پر چھرے سے حملہ کر دیا۔ میرے اس حملے کا یہ فائدہ ہوا کہ شارک نے رکی کو چھوڑ دیا اور مجھ پر لپکی۔ میرا دوست رکی شدید زخمی ہو چکا تھا۔ دونوں لڑکوں نے اپنے اپنے چھروں سے شارک پر حملہ کر دیا۔ میں یہ روح فرسا نظارہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ شارک ان حملوں سے بے نیاز ہم سے لڑ رہی تھی۔ ایک لڑکے کو اس نے دانتوں سے شدید زخمی کر دیا تھا۔ میرے اگلے وار سے پہلے ہی مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میری کمر کا سارا گوشت کاٹ لیا ہو۔ دوسرا گھاؤ مجھے پیٹ کے پاس لگا۔ اس موذی کے دانتوں کے سامنے غوطہ خوری کا موٹا لباس کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ آخری بار بے ہوش ہونے سے قبل میں نے دیکھا کہ دونوں لڑکے زخمی ہونے کے باوجود اپنے چھروں سے شارک پر تابڑ توڑ حملے کر رہے ہیں۔

مجھے جب ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک جھونپڑی میں لیٹا پایا۔ مجھے بتایا گیا کہ رکی اب اس دنیا میں نہیں ہے اور دونوں لڑکوں میں سے ایک زخموں سے ہلاک ہو چکا ہے۔ خود مقامی ڈاکٹر میری حالت سے مطمئن نہیں تھے۔ مجھے دو روز کے بعد جاپان لے جایا گیا جہاں میں پورے چھ ماہ زیر علاج رہا۔ رکی کی موت کا افسوس مجھے ساری عمر رہے گا۔ کاش وہ بیچارہ اس قاتل شارک کی لاش کی تصویر بناتا جسے ہم سب نے مارا تھا۔ ایلاتی کی یہ بلا پورے پچاس فٹ لمبی تھی۔ مجھے بعد میں مقامی لوگوں نے بتایا تھا جو اس وقت وہاں پہنچے کہ جب یہ جنگ لڑی جا رہی تھی تو اس بحری بلا کو ایک نوجوان نے بڑی بہادری سے ہلاک کر دیا تھا۔ ☆☆☆

ایثار

لباس کے معاملے میں حضرت ابوذر غفاریؓ کسی وضع کے پابند نہیں تھے اور نہ ہی آپؓ لباس کا کوئی خاص اہتمام فرماتے تھے۔ ان کی پوری زندگی سادگی تقویٰ اور قناعت کا نمونہ تھی۔ جو مل جاتا' وہی تن ڈھانپنے کے کام آتا۔ ہر وقت اور ہر لحہ اپنے آپ کو خداوند تعالیٰ کے حضور جوابدہ گردانتے اور اسی بات کی ہمیشہ تاکید کرتے رہتے تھے۔ کسی کی کوئی بھی بات جو ان کے نزدیک اسلامی تعلیمات اور سنت نبویؐ کے مطابق نہ ہوتی' ان کی برداشت سے باہر ہوتی تھی۔ گویا اپنے قول اور فعل دونوں اعتبار سے ان کی شخصیت قابلِ تقلید تھی۔

ایک دن لوگوں نے حضرت ابوذرؓ کو نہایت پرانا اور خستہ کمبل اوڑھے ہوئے دیکھا۔ کسی نے آپؓ کو روکا اور پوچھا: اے ابوذرؓ! کیا آپ کے پاس اس پھٹے پرانے کمبل کے علاوہ کوئی اور لباس نہیں تھا جو اس حالت میں آپ گھوم رہے ہیں؟ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا: میرے بھائی! اگر اس سے اچھا لباس میرے پاس ہوتا تو میں ضرور استعمال کرتا۔" اس شخص نے پھر کہا: کل ہی تو ہم آپؓ کو ایک نہایت صاف اور قیمتی لباس میں دیکھ چکے ہیں۔ وہ لباس کیا ہوا؟ آپؓ نے جواب دیا: "تم ٹھیک کہتے ہو۔ کل میرے جسم پر ایک اچھا لباس تھا مگر وہ میں نے ایک ضرورت مند کو دے دیا تھا۔
اس شخص نے حیرت سے سوال کیا کہ آپ سے زیادہ کوئی اور ضرورت مند ہو سکتا ہے؟
حضرت ابوذرؓ نے فرمایا: "میرے پاس یہ کمبل تو ہے اُس غریب کے پاس یہ بھی نہیں تھا"۔

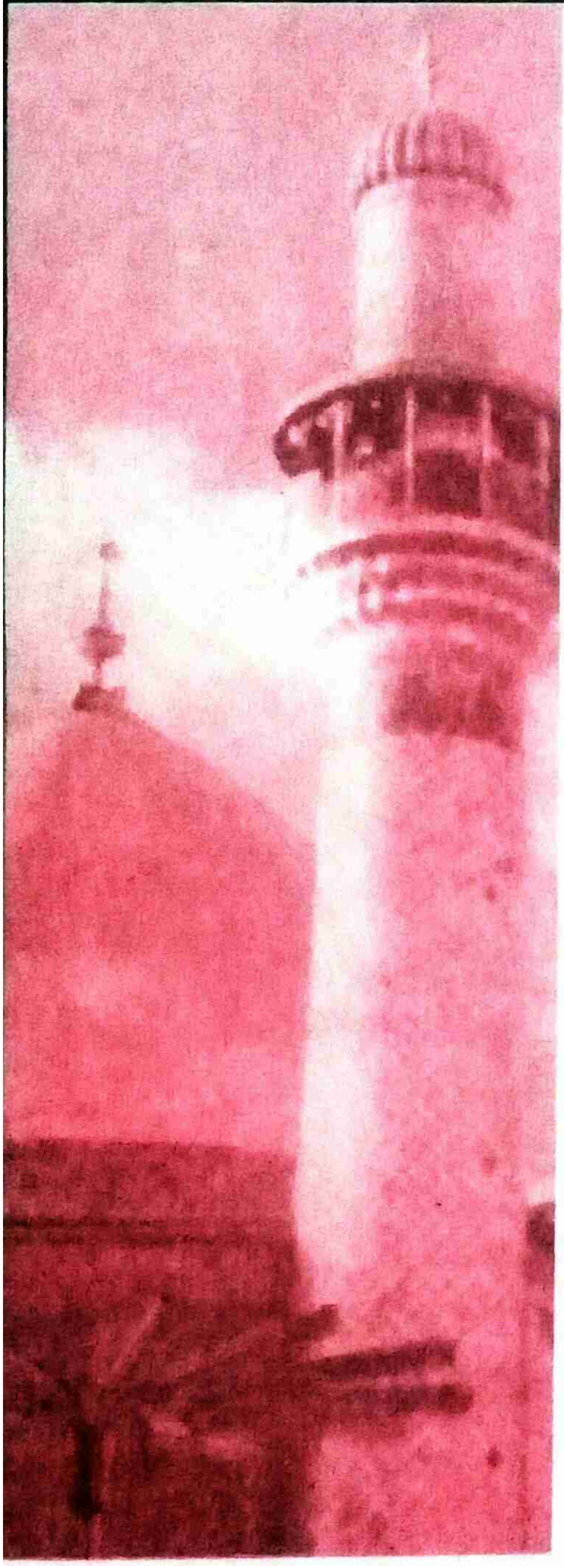

ضمیر کی آواز

وجیہہ طاہر

"میں نے اپنے ضمیر کی آواز سنی۔ میرے ضمیر نے یہ کہا" اس قسم کے جملے آپ نے سنے بھی ہوں گے اور مطالعہ کے دوران پڑھے بھی ہوں گے۔ ضمیر کی آواز یا خود "ضمیر" آخر ہے کیا چیز؟ ضمیر دراصل وہ قدرتی صلاحیت ہے جو انسان کو کسی بھی اچھائی کو اچھا جاننے اور اسے اپنانے کے ساتھ ساتھ بدی یا برائی کو برا سمجھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت سے انسان کے اندر یہ صلاحیت رکھی ہے۔

ایک اچھا انسان جھوٹ کو ہمیشہ برا خیال کرے گا اور اس کے مقابلے میں سچ کو نہ صرف اپنائے گا بلکہ سچ کی حمایت بھی کرے گا۔ وہ نہ صرف مظلوم کا ساتھ دے گا بلکہ ظلم اور ظلم کرنے والوں کا ہاتھ روکنے کے لیے ہر طرح سے اپنے آپ کو آمادہ بھی پائے گا۔ کیا خیال ہے آپ کا' ہے نا یہ قدرتی بات! اسی لیے کہتے ہیں کہ ہمیشہ اپنے ضمیر کو زندہ رکھنا چاہیے۔ مگر یاد رہے کہ زندہ و توانا ضمیر کے لیے ایمان کی روشنی ناگزیر ہے۔ ایمان کی پختگی' خوفِ خدا اور اخلاص نیت ہی سے انسان کی انسانیت اور اُس کے ضمیر کو زندگی اور توانائی حاصل ہوتی ہے۔

ضمیر مردہ ہو جائے تو انسان درندوں اور دوسرے حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

تاریخ جہاں بے ضمیر' ظالم اور فاسق وفاجر لوگوں کے شرمناک حالات سے بھری پڑی ہے وہاں باضمیر' صاحب ایمان اور اولوالعزم انسانوں کے درخشاں کردار و واقعات سے بھی روشن و منور ہے۔ اگر کہیں ظلم ہو رہا ہے تو اس ظلم کو روکنے والے ہاتھ بھی ضرور موجود ہیں۔ اگر کچھ لوگ جھوٹ اور مکرو فریب کا سہارا لے رہے ہیں تو کچھ ایسے بھی خدا کے بندے ہیں جو ہر صورت میں صداقت کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی ظالم غریب کا لقمہ چھین رہا ہے تو ایسے حساس اور باضمیر لوگوں کی بھی کمی نہیں جو جھولیاں بھر بھر کر حق داروں کو ان کا حق لوٹا رہے ہیں۔

نمرود کے مقابلے میں حضرت ابراہیمؑ' فرعون کے مقابلے میں حضرت موسیٰؑ اور یزید کے مقابلے میں حضرت حسینؑ کا زندہ و تابندہ کردار ناگزیر ہی نہیں' ایک اٹل حقیقت بھی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ باطل کے مقابلے میں ابراہیم و موسیٰ (علیہم السلام) ہی آخر کار فتح مند اور سرخرو ہوئے۔ ابوجہل کی تمام تر شیطانیت ناکام و نامراد ہو کر رہی اور خدا کے آخری اور سب سے برگزیدہ رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی کامیاب و کامران ٹھہرے۔ آج یزید کا کوئی نام لیوا نہیں جبکہ حضرت حسینؑ اپنے بہتر جاں نثاروں کے ساتھ حق و صداقت اور جرأت و بیباکی کا مینارہ نور بن کر زندہ و تابندہ ہیں۔ بلاشبہ ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے اور حق کا ساتھ دینے والے ہی ہمیشہ سربلند رہتے ہیں۔

ہمیشہ حلال اور حرام' نیکی اور بدی' حق اور باطل اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دوست اور دشمن کی پہچان نظر میں رکھیے۔ صبر اور استقامت کا دامن نہ چھوڑیے۔ کوشش' محنت اور جدوجہد کا راستہ اپنائیے اور باہمی احترام اور حق و انصاف کا بول بالا کیجیے! یہی انسانیت کا تقاضا اور ضمیر کی آواز ہے۔

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی: ہمارے ہیں حسینؑ

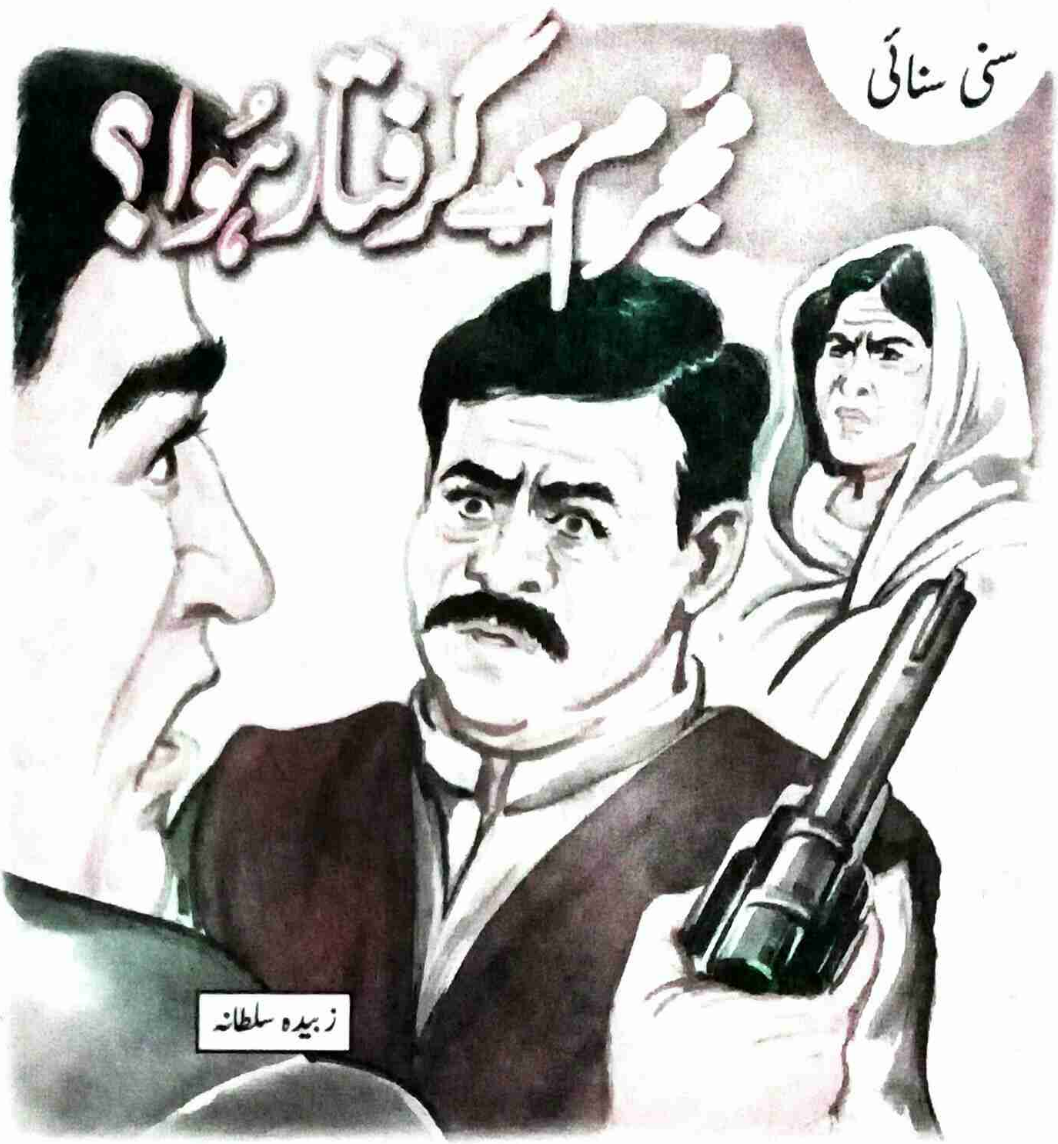

مرزا حامد اور ان کی بیگم اپنے چھوٹے سے بنگلے میں پرسکون زندگی بسر کر رہے تھے۔ بیٹی شادی ہو کر بیرونِ ملک چلی گئی تھی۔ بیٹا بھی امریکا میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ بیٹے کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے ان میاں بیوی کو بڑی کفایت شعاری سے کام لینا پڑتا تھا اسی لیے بیگم گھر کے سب کام خود اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ صفائی دھلائی تک کے لیے کوئی ملازم مقرر نہیں کر رکھا تھا۔

اُس روز ابھی وہ دونوں نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ صدر دروازے پر کال بیل بجی۔ مرزا حامد نے جا کر گیٹ کھولا تو آنے والا کچھ کہے سنے بغیر انہیں ایک طرف دھکیل کر اندر گھس آیا اور گیٹ بند کر دیا اور مرزا صاحب کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا: "مجھے تمہارے گھر میں شام تک کے لیے پناہ چاہیے! خبردار کسی قسم کی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا! اور کون ہے اس گھر میں؟"

"صرف میری بیگم ہیں" مرزا حامد نے پریشان ہو کر جواب دیا۔

"چلو اندر چلو اور اپنی بیگم کو بھی تاکید کر دو کہ بالکل خاموش رہے!"

وہ مرزا حامد کو رائفل کی نالی پر رکھے ہوئے اندر لایا تو بیگم کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"خاموش! آواز نکالی تو تم دونوں کو گولی کا نشانہ بنا دوں گا!"

اس نے رائفل کی نالی مرزا کی پسلی میں گاڑتے ہوئے دبی آواز میں دھمکی دی۔ بیگم نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا اور بولیں:

"ہرگز کوئی آواز نہیں نکالے گا بھیا! مگر تمہارے کیچڑ بھرے بوٹوں سے میرا قالین خراب ہو رہا ہے۔ تم اپنے بوٹ اُتار دو مرزا صاحب انہیں صاف کر دیتے ہیں"۔

آنے والا شخص اس بات سے اور بیگم کی مطمئن آواز سے حیران رہ گیا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے کڑک کر بولا:

"بہت ہوشیار معلوم ہوتی ہو تم! کیا مطلب ہے تمہارا کہ میرے بوٹ صاف کرنے کے بہانے تمہارا شوہر میری نگاہوں سے اوجھل ہو کر پولیس کو فون کر دے؟"

"نہیں تم غلط سمجھے یہ تمہارے سامنے ہی رہیں گے......"

بیگم نے کہا تو وہ بات کاٹ کر بولا...... "خیر میں بوٹ اُتار دیتا ہوں مگر انہیں صاف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔ وہ رائفل ویسے ہی ان دونوں کی طرف تانے ہوئے ایک ہاتھ سے بوٹ اُتارنے لگا۔ مگر بیگم نے دیکھا کہ اس کے تو کپڑے بھی بھیگے ہوئے اور کیچڑ میں بھرے تھے۔ شاید کہیں سے فرار ہو کر تعاقب سے بچتا ہوا وہ کسی

گڑھے میں گرا ہو گا۔ رات ہی بارش ہوئی تھی سب راستے پانی اور کیچڑ سے بھرے تھے۔

تم کہو تو ناشتا تیار کر لوں؟ تم نے بھی ناشتا کرنا ہو گا!" بیگم نے پوچھا۔

"ہاں کر لو! مگر اتنا خیال رکھنا کہ تمہارا شوہر میری گولی کی زد میں ہے اگر تم نے ذرا بھی گڑ بڑ کی تو پہلے اسے گولی ماروں گا پھر تمہیں۔ یاد رکھو اگر کسی ذریعے سے پولیس تمہارے دروازے پر پہنچ گئی تو میں دونوں کو گولی مار دوں گا!"

بیگم بغیر کچھ جواب دیئے کچن میں چلی گئیں۔ مجرم کو ایک دم کچھ خیال آیا تو حامد مرزا کو لئے ہوئے ان کے پیچھے ہی کچن میں چلا آیا۔ ایک چھوٹی سی میز کے آمنے سامنے دو کرسیاں پڑی تھیں وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دوسری پر مرزا کو بٹھا لیا۔ ایک دم اُسے کچھ خیال آیا تو بولا:

"تمہارا فون کہاں ہے؟"۔

"ڈرائنگ روم میں"۔ مرزا نے جواب دیا۔

"چلو مجھے دکھاؤ"۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"بھیا ٹیلی فون کو کچھ نہ کرنا! ہم تو تمہارے سامنے ہیں۔ فون کون کرے گا؟"

بیگم نے بڑے حوصلے سے اُسے ٹوکا مگر وہ ڈپٹ کر بولا:

"تم چپ رہو......" اور مرزا کے ساتھ جا کر ٹیلی فون کے تار کاٹ دیئے۔ اتنے میں بیگم نے دو آدمیوں کا ناشتا تیار کر کے میز پر لگا دیا"۔

"تم نے ناشتا نہیں کرنا؟" مرزا نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں صرف قہوہ پیوں گی۔ تمہیں معلوم تو ہے کہ مجھے "ڈائریا" ہو رہا ہے"۔

بیگم نے جواب دیا تو مرزا خاموشی سے ناشتا کرنے لگے۔ مجرم نے تو خوب ڈٹ کر کھایا مگر مرزا بیچارے صرف چائے پیتے رہے۔ مجرم نے گھر کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا نہ ہی مال کا مطالبہ کیا۔ اُسے صرف اپنی جان بچانے کی فکر تھی کیوں کہ وہ ڈاکہ ڈالنے کے دوران چوکیدار کو قتل کر کے بھاگا تھا اور پولیس اس کے پیچھے تھی۔

"بھیا! مجھے تو میرے بیڈ روم میں رہنے دو۔ کیونکہ مجھے بار بار "موشن" ہو رہے ہیں اور میں واش روم کے قریب رہنا چاہتی ہوں" بیگم نے بڑی منت سے کہا تو وہ کچھ سوچ کر بولا "چلو ہم بھی تمہارے قریب ہی رہنا چاہتے ہیں۔ میں اتنا بھی سیدھا نہیں کہ تمہیں آنکھوں سے اوجھل ہونے دوں۔ تم مجھے بڑی چالاک عورت معلوم ہوتی ہو۔ حامد مرزا کو اس کی اس بات پر بے حد غصہ آیا مگر دل ہی دل میں کھول کر رہ گئے۔ اس حالت میں بھی کیا کر سکتے تھے کہ رائفل کی نالی ان کے پہلو میں گڑی ہوئی تھی۔ تینوں اُٹھ کر بیڈ روم میں چلے آئے۔ بیگم واش روم جانے لگیں تو مجرم انہیں ڈانٹ کر بولا:

"ٹھہرو! پہلے مجھے اندر جا کر دیکھ لینے دو!" یہ کہہ کر اُس نے پہلے مرزا صاحب کو اندر دھکیلا ان کے پیچھے خود رائفل بدستور ان کی پسلی میں گاڑے ہوئے واش روم میں داخل ہو کر جائزہ لینے لگا۔ تقریباً سات آٹھ فٹ اوپر تک بہت چھوٹا سا روشن دان تھا۔ آئینے کے سامنے چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں پڑی تھیں۔ دو چار بیگم کی سنگھار کی اشیاء تھیں۔ وہ اچھی طرح دیکھ بھال کر واپس نکل آیا۔ مرزا صاحب نے اس کی اجازت سے اخبار پکڑ لیا۔ بیگم واش روم سے نکل کر کونے میں پڑے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ مرزا صاحب پندرہ بیس منٹ اخبار دیکھنے میں مصروف رہے پھر اخبار قریب رکھی تپائی پر ڈال دیا اور جگ میں سے پانی گلاس میں ڈالا اور کھنگار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولے:

"بھائی صاحب! آپ کا پروگرام کیا ہے؟ آخر ہمیں کب تک ہمارے ہی گھر میں نگرانی میں رکھنے کا ارادہ ہے؟" یہ سن کر مجرم نے پہلے تو تیز نظروں سے انہیں گھورا لیکن پھر جیسے ذہن نے کوئی معقول راستہ دکھایا اس کے تیور کچھ سیدھے ہو گئے اور وہ نرم لہجے میں بولا:

"بس شام تک تم میری حراست میں رہو گے۔ شام کا اندھیرا گہرا ہوتے ہی تم دونوں اپنی گاڑی پر مجھے یہاں سے باہر نکال کر جہاں میں کہوں مجھے پہنچاؤ گے۔ بس اس کے بعد تم آزاد ہو"۔

"بھیا! کہو تو کچن میں جا کر کھانے کا کچھ انتظام کر لوں؟"

بیگم نے ایسے کہا جیسے وہ بھی ان کے گھر کا ایک فرد ہو۔ جس سے وہ مشورہ لے رہی ہوں۔ بہر حال اب وہ اکھڑ دماغ والا مجرم بھی ان دونوں میاں بیوی کے سلوک اور رویے سے متاثر ہو کر کچھ نرمی اختیار کر رہا تھا' کہنے لگا:

"ابھی تو بہت وقت پڑا ہے۔ جب وقت ہو گا چلے چلیں گے کچن میں۔ کیا گھر میں کچھ پکا ہوا موجود نہیں؟"

"دو سالن موجود ہیں۔ دہی بھی ہے۔بس روٹیاں پکانی ہوں گی۔میں نے اپنے لیے تھوڑی سی کھچڑی پکانی ہو گی" بیگم نے کہا۔

"ہاں تم نے تو ناشتا بھی نہیں کیا۔ ٹھیک ہے چلو کچن میں چلتے ہیں" وہ بڑے سلوک سے بات کرنے لگا مگر رائفل کی نالی اپنی جگہ سے نہ ہٹی!

"بیگم نے کہا: آپ دونوں چلیں میں واش روم سے ہو کر آتی ہوں"۔ یہ سن کر وہ اٹھتے اٹھتے پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ دس منٹ بعد بیگم واپس نکلی تو تینوں اٹھ کر کچن میں آئے۔ بیگم نے گیس کا چولہا روشن کیا۔ فرج سے سالن نکال کر گرم کیے۔ دال چاول نکال کر بھگوئے اور توا رکھ دیا۔ دوسرے چولہے پر کھچڑی کا بھگار بنایا۔ روٹیاں پکاتے پکاتے ساتھ ہی کھچڑی دم پر لگا دی۔ وہ چپ چاپ بیٹھا دیکھتا رہا۔ دو چار روٹیاں پک گئیں تو بیگم نے ان کے آگے پلیٹیں رکھیں اور ڈونگوں میں سالن نکال کر میز پر رکھ دیا اور بڑے نرم لہجے میں بولیں جیسے ان کا کوئی عزیز مہمان آیا ہو:

"بسم اللہ کیجیے! گرم روٹی پک رہی ہے"۔

"کھانا کھا کر اُٹھتے ہوئے وہ ان کے رویے سے اس قدر متاثر تھا کہ معذرت کے لہجے میں کہنے لگا:

"مجھے افسوس ہے۔ لیکن میری پوزیشن ہی کچھ ایسی ہے کہ میں ایسے طرز عمل پر مجبور ہوں۔ مجھ سے جرم ہو چکا ہے اور پولیس میری تلاش میں ہے۔ اگر میں پکڑا جاؤں تو پھانسی کے تختے تک پہنچ جاؤں گا۔ اسی لیے اپنی جان بچانے کے لیے مجھے سختی سے احتیاط کرنی ہے"۔

"کوئی بات نہیں بھائی صاحب! ہم آپ کی مجبوری کو سمجھتے ہیں۔ آپ نے ہمارے گھر میں پناہ لی ہے۔ آپ کی حفاظت ہمارا فرض ہے اگر آپ احتیاط نہ بھی کریں تو ہم آپ کی حفاظت کریں گے۔ اس چار دیواری کے اندر ہوتے ہوئے آپ کو کوئی خطرہ نہیں!" مرزا حامد نے بڑے دوستانہ انداز میں جواب دیا۔ مگر بیگم دل ہی دل میں کہہ رہی تھیں:

"مردود کہیں کے! جس کی تو نے جان لی اُسے اپنی جان عزیز نہ تھی؟ دوسرے کی زندگی کی بھی ایسے ہی حفاظت ہونی چاہیے جیسے اپنی زندگی کی"۔

شام کی چائے سے بھی بن بلائے مہمان کی تواضع کی گئی۔ اس دوران میں بیگم کے "ڈائریا" کو کچھ بھی افاقہ نہ ہوا تھا وہ دوپہر کے کھانے کے بعد بھی دو دفعہ واش روم جا چکی تھیں۔ حامد مرزا بار بار وال کلاک پر نگاہ ڈال رہے تھے۔ خدا خدا کر کے مغرب کی اذان ہوئی۔ پھر گھنٹا بھر اور گزرا اچھی خاصی تاریکی پھیل گئی تو مجرم اُٹھ کھڑا ہوا اور حامد مرزا سے مخاطب ہو کر بولا:

"لو اب تم لوگوں کی مصیبت ختم ہونے والی ہے۔ میرے پروگرام کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر میری منزل تک پہنچا دو"۔

حامد مرزا نے گاڑی کی چابی میز پر سے اُٹھائی اور بولے: "چلو!"

"تم بھی ساتھ آجاؤ!" اس نے بیگم سے کہا۔

"یہ ساتھ جا کر کیا کریں گی؟ میں ہی آپ کو چھوڑ آتا ہوں" حامد مرزا نے اعتراض کیا۔ "جیسے میں کہتا ہوں ویسے ہی کرو!" وہ پھر تند آواز میں بولا۔

اچھا اچھا خفا نہ ہو میں چلتی ہوں!" بیگم فوراً بولیں اور چادر اوڑھ کر ساتھ چل پڑیں۔ حامد مرزا اپنی بیگم کی طرف سے بے حد فکر مند ہو گئے۔ ساتھ ہی بیگم کو اس قدر پر سکون دیکھ کر حیران بھی تھے۔ انہوں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ بیگم ان کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ مجرم پیچھے کی سیٹ کے سامنے والی جگہ پر نیچے بیٹھ گیا اور رائفل کی نالی حامد مرزا کی گردن کے پیچھے ٹکا دی اور اس حالت میں گاڑی سڑک پر آکر مجرم کے اشارے پر روانہ ہوئی۔ خاصی تیز رفتاری سے چلتے چلتے ایک گھنٹا گزر گیا۔ شہر کی آبادی سے نکل کر اب گاڑی بیرون شہر کی آبادیوں میں سے گزر رہی تھی۔ آخر مجرم نے حامد مرزا کو سڑک سے نیچے اتر کر گاڑی درختوں کے ایک گھنے

جھنڈ میں روکنے کا حکم دیا۔ دروازہ کھول کر نیچے اترتے ہوئے وہ بولا "میرے جانے کے دس منٹ بعد تم لوگ واپس جا سکتے ہو! یاد رکھو دس منٹ تک تمہاری گاڑی حرکت نہ کرے!"

"ٹھیک ہے" حامد مرزا نے کہا۔ لیکن وہ دس قدم چلنے نہ پایا تھا کہ پیچھے سے سرچ لائٹ کی تیز روشنی سے سارا تاریک ماحول روشن ہو گیا اور گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ان دونوں میاں بیوی نے دیکھا کہ پولیس کے کئی آدمی دوڑتے ہوئے آگے بڑھے اور مجرم کے گرد گھیرا تنگ کر لیا اور اُسے ہتھکڑیاں پہنادی گئیں۔

بیگم تو جیسے اس منظر کی منتظر تھیں، لمبا سانس لیتے ہوئے بولیں:

"اللہ کا انصاف اٹل ہے۔ اس سے تو کوئی نہیں بچ سکتا چاہے کتنی ہی احتیاط کرے!" مگر حامد مرزا حیران تھے کہ آخر یہ سب کیسے ممکن ہوا۔

جب پولیس کی گاڑی مجرم کو لے کر روانہ ہوئی تو پیچھے پیچھے حامد مرزا کی گاڑی تھی اور بیگم ان کو ساری کہانی سنا رہی تھیں کہ مجرم کیسے گرفتار ہوا۔ جب وہ بہانے سے واش روم جاتیں تو ٹشو پیپر کے رول میں سے ایک لمبا ٹکڑا پھاڑ کر اس کے اوپر لپ سٹک کے ساتھ تین چار سلپ لکھ کر روشن دان سے باہر پھینک دیتیں۔ پہلی بار انہوں نے تین چار لمبے ٹکڑوں پر لکھا کہ "ہمارے مکان نمبر...... میں ایک مجرم نے پناہ لے رکھی ہے پولیس ہماری مدد کرے" اس کے بعد اسی طرح تین چار سلپ اس مضمون کے لکھ کر پھینکے...... "پولیس ہمارے گھر دستک نہ دے ورنہ مجرم ہمیں گولی مار دے گا"۔

اس کے بعد جب مجرم نے حامد مرزا کو اپنا پروگرام بتایا تو بیگم نے واش روم میں جا کر پھر تین چار لمبے سلپ ٹشو پیپر کے پھاڑے اور ان پر لکھا "شام کو مجرم ہماری گاڑی میں واپس جائے گا ہم اُسے جہاں وہ کہے گا پہنچانے جائیں گے"۔

جب پہلا پرچہ کسی کے ہاتھ آیا تو اُس نے پولیس کو خبر دی۔ پولیس اس روشندان کی نگرانی کرنے لگی جس سے کاغذ برآمد ہوتے تھے۔ اس طرح انہوں نے دور رہ کر گاڑی کے نکلنے کا انتظار کیا اور اس کا تعاقب کر کے مجرموں کے اڈے تک پہنچے۔ جہاں سے انہوں نے نہ صرف ایک مجرم کو بلکہ باقی سب ڈاکوؤں کو بھی گرفتار کیا جنہوں نے پچھلی رات مارکیٹ میں ڈاکہ ڈالا تھا اور یہ سب ایک خاتون کی حاضر دماغی سے ممکن ہوا!

☆☆☆

پاکستان ہماری جان

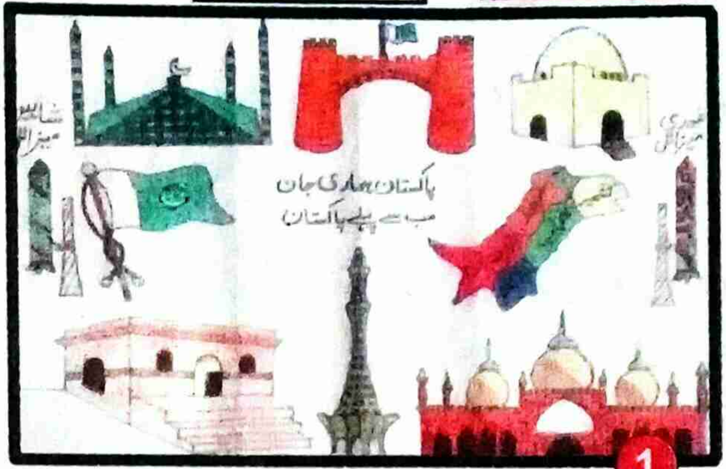

1 علی طاہر، سیالکوٹ (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

2 محمد شہاب راولپنڈی (دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں)

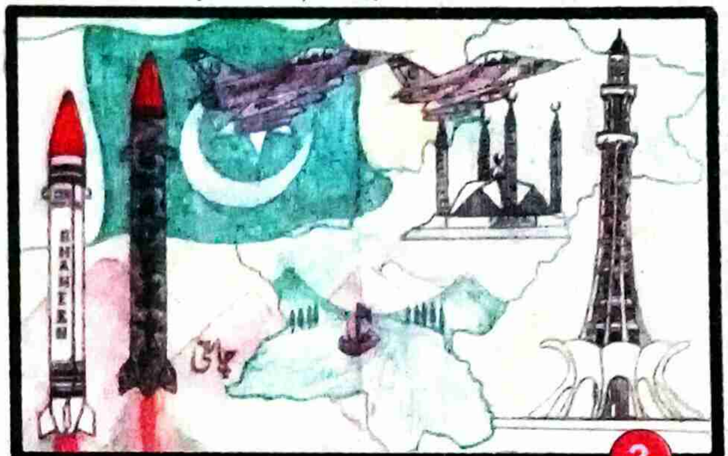

3 عبیدالرحمان، کسووال (تیسرا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

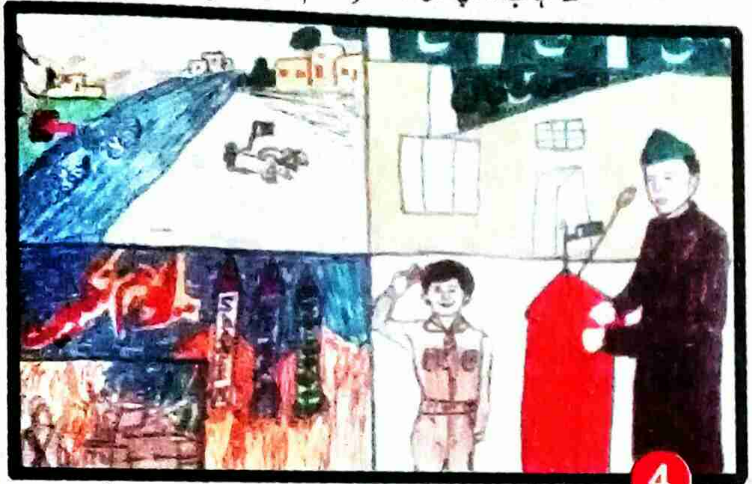

4 رضوان عبدالمجید، منڈی بہاؤالدین (چوتھا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

5 عروج مظفر، لاہور (پانچواں انعام: 40 روپے کی کتابیں)

6 محمد عزیز، جھنگ شہر (چھٹا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں:۔ طارق محمود گوجرانوالہ۔ ارسلان اسلم سانگلہ ہل۔ ضیاء مصطفیٰ کامرہ۔ عرفان یوسف منڈی بہاء الدین۔ ایاز محمود رکن پور۔ سید عبدالرزاق بنوں۔ حسیب حسن ڈیرہ غازی خان۔ نعمان خان مردان۔ قنبر علی اسلام آباد۔ عدنان جاوید پنن وال۔ اقرا کبیر راولپنڈی۔ طیبہ تسنیم لاہور۔ مدیحہ نثار گوجرانوالہ۔ شہروز علی سیالکوٹ۔ فیصل یاسین کراچی۔ نازش افتخار گجرات۔ عائشہ ایبٹ آباد۔ قیصر پرویز کامرہ۔ سکندر تیمور راولپنڈی۔ سہیل مظہر میانوالی۔ اقرا شاہد راولپنڈی۔ رابعہ رؤف سرگودھا۔ خرم عباس جوہر آباد۔ نعمان علی حیدر آباد۔ فرحان جاوید لاہور۔ طلحہ نثار ملتان۔ عدنان احمد قصور۔ محمد اصغر لاہور۔

اپریل کا موضوع: ہمارا گاؤں — آخری تاریخ 10 مارچ

مئی کا موضوع: ہمارا کسان — آخری تاریخ 10 اپریل

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت میں مصور پنا نام، عمر، کلاس، اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

جو کرتے ہیں دنیا میں محنت زیادہ

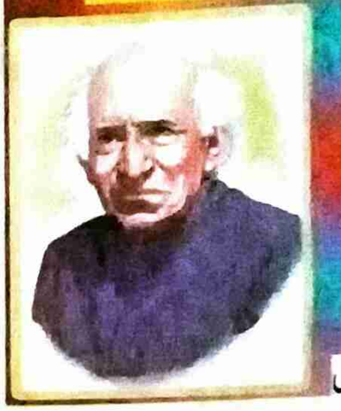

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

سید محمد جاوید امتیازی

ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ
پیتا تھا وہ سوڈا واٹر
کھاتا تھا بادام اخروٹ
ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ

فرحان ادھر ادھر گھومتا پھرتا لہک لہک کر یہ نظم پڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پنسل لینے کے لیے میرے کمرے میں آیا تو میں نے پوچھ ہی لیا: "حانی! بیٹا معلوم ہے ٹوٹ بٹوٹ والی نظم کس شاعر نے لکھی ہے؟" ہم سب گھر والے اُسے پیار سے "حانی" کہتے ہیں۔ میرا سوال سنتے ہی بولا: پاپا! صوفی تبسم نے۔ "میاں صاحبزادے! جواب تو آپ کا درست ہے، لیکن صوفی تبسم کا پورا نام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ہے اور وہ ملک کے نامور شاعر، اُستاد اور ماہر تعلیم تھے"۔ میں نے ذرا وضاحت کرتے ہوئے بتلایا۔ فرحان میرے پاس ہی بیٹھ گیا اور بڑے شوق سے میری باتیں سننے لگا۔ آیئے آج آپ کو بھی اس بڑی شخصیت کے بارے میں بتاتے چلیں!

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم 4 اگست 1899ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ کسی زمانے میں کشمیر سے آکر یہاں آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے چرچ مشن سکول امرتسر میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ خالصہ کالج سے ایف اے اور ایف سی کالج لاہور سے بی اے کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی ٹی اور ایم اے (فارسی) کی ڈگریاں حاصل کیں اور سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں تعلیم و تدریس کا فریضہ انجام دینے لگے۔ یہاں تین سال کام کرنے کے بعد 1927ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں فارسی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ 1931ء میں تبدیل ہو کر گورنمنٹ کالج لاہور میں آگئے۔ اسی زمانے میں آپ کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہوا اور شعر و ادب کے حوالے سے ان کی مقبولیت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے 1954ء میں ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ انہوں نے خانہ فرہنگ ایران کے ڈائریکٹر کے طور پر کام کیا۔ ہفت روزہ "لیل و نہار" کے ایڈیٹر بھی رہے۔ پھر آپ نے ریڈیو پاکستان میں بطور مشیر، سکرپٹ رائٹر اور براڈ کاسٹر کام کیا اور کم و بیش پندرہ سال تک ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہنے کے بعد دوسری بار ریٹائر ہوئے۔

صوفی تبسم اقبال اکیڈیمی کے نائب صدر اور پاکستان آرٹس کونسل لاہور کے صدر بھی رہے۔ انہوں نے بہت سے وفود میں بطور شاعر و ادیب اور ماہر تعلیم بیرون ملک پاکستان کی نمائندگی کی۔ انہوں نے طویل عمر پائی مگر ذہنی طور پر بڑھاپے کی تھکان سے محفوظ رہے۔ وہ ہر وقت اپنے آپ کو علمی و ادبی سرگرمیوں میں مصروف رکھتے تھے۔ انہیں شاعر مشرق علامہ اقبالؒ سے بھی ملاقات کا شرف حاصل رہا۔ آخری ایام میں بھی وہ "مجلس زبان دفتری"۔ صد سالہ جشن اقبالؒ کمیٹی اور "جشن امیر خسروؒ" کی کمیٹی کے سرگرم رکن تھے۔ وہ محکمہ فیملی پلاننگ کے ادبی میگزین "سکھی گھر" کے علاوہ ٹیکسٹ بک بورڈ کے مشیر بھی تھے۔

نہایت خوش لباس، خوش اطوار، اور عام طور پر بغل میں چھوٹا سا بیگ دبائے، سرخ و سفید رنگت، درمیانہ قد، کشادہ پیشانی، اونچی اور نمایاں ناک اور نرم لہجے والے صوفی تبسم بڑی ہی زندہ دل اور علم پرور شخصیت کے مالک تھے۔ وہ نظم و نثر کی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ انہوں نے امیر خسرو کا فارسی کلام اردو میں منتقل کیا اور غالب و اقبال کی نظمیں پنجابی میں ترجمہ کیں۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران ان کے لکھے ہوئے ترانے بڑے مقبول ہوئے۔ بچوں کے ادب میں صوفی تبسم کو بڑا مقام حاصل ہے۔ وہ اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کا تخلیق کردہ دلچسپ کردار "ٹوٹ بٹوٹ" لافانی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک طرح سے وہ تین صدیوں کی زندہ و تابندہ شخصیت تھے۔ انہوں نے انیسویں صدی میں آنکھ کھولی، بیسویں صدی میں زندگی بسر کی اور اکیسویں صدی کو سامنے پا کر 79 سال کی عمر میں 7 فروری 1978ء کو اس دنیا کو الوداع کہا۔

ماٹ اور باٹ

تاج انصاری

دو تھے لڑکے ماٹ اور باٹ
بنی لڑائی چنے کی چاٹ
ماٹ نے باٹ کو تھپڑ مارا
باٹ دھڑام سے گرا بے چارا
ٹوٹ گئی لوہے کی کھاٹ
دو تھے لڑکے ماٹ اور باٹ
ہوئی جو دونوں کی رسوائی
ٹوٹ بٹوٹ نے صلح کرائی
تینوں نے پھر چاٹ بنائی
ایک پلیٹ میں سب نے کھائی
بستر ان کا ہے اب ٹاٹ
دو تھے لڑکے ماٹ اور باٹ

بچوں کی نظموں کے حوالے سے تاج انصاری کا نام نیا نہیں ہے۔ وہ ایک مدت سے بچوں کے لیے پیاری پیاری نظمیں تخلیق کر رہے ہیں۔ اُن کی اس نظم: "ماٹ اور باٹ" کو ہمارے ممتاز بزرگ شاعر صوفی تبسم نے بھی بے حد پسند کیا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ اس میں ان کے اپنے "ٹوٹ بٹوٹ" نے ماٹ اور باٹ کے درمیان صلح کرا کے بڑا نیکی کا کام کیا اور یہ بات ہے بھی بہت اچھی...... کیوں بچو، ہے نا!

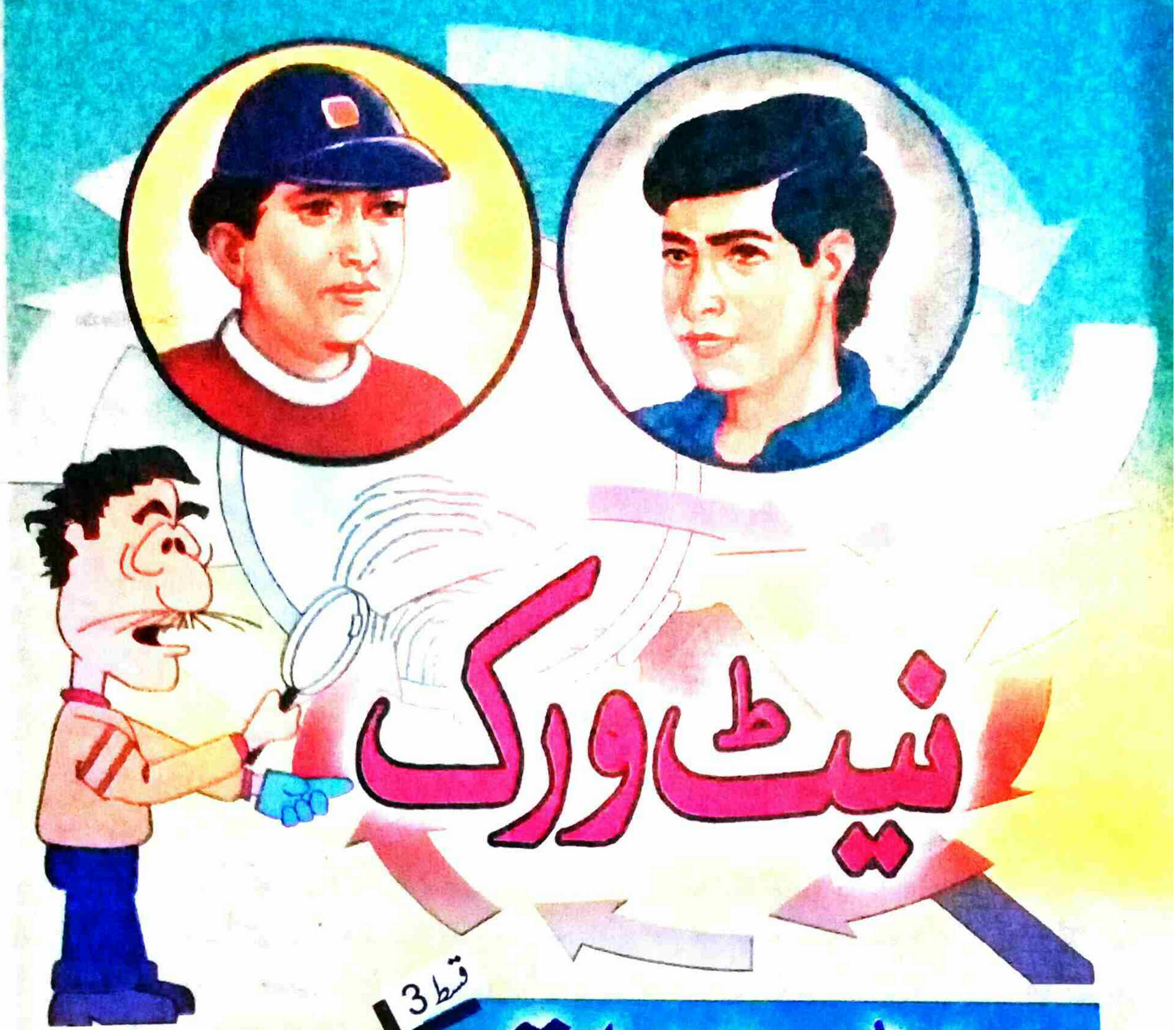

نیٹ ورک

قسط 3

ہنٹر والا ہاتھ

منظر رضا ہاشمی

اپنے گھر میں طیب انتہائی پریشان تھا اور طارق سامنے کرسی پر سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ طیب سے بھی زیادہ پریشان لگ رہا تھا۔ اس وجہ سے اس کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے اور آنکھیں الو کی طرح گول ہو گئی تھیں۔ وہ جب بھی پریشان ہوتا تھا اس کی آنکھیں اسی طرح ہو جاتی تھیں۔ وہ ہوٹل میں کافی دیر تک طاہر کا انتظار کرتے رہے۔ وہ واپس نہ آیا تو یہ لوگ گھر آگئے۔ انہوں نے راحت بھائی کو فون کر دیا تھا۔ اب وہ دونوں خاموش بیٹھے تھے کہ تھوڑی دیر بعد راحت بھی پہنچ گئے۔ ان کے دریافت کرنے پر طیب نے سارے حالات تفصیل سے بتا دیئے۔

"اوہ! اس کا مطلب ہے کہ دہشت گرد یہ جان چکے ہیں کہ تم لوگ ان کی ٹوہ میں ہو۔ اس لیے انہوں نے تمہاری نگرانی شروع کر دی"۔ راحت بھائی نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ہاں! چونکہ اخبارات میں کافی دفعہ ہماری تصویریں اور انٹرویوز شائع ہو چکے ہیں اس لیے مجرموں کا ہم سے خوفزدہ ہو کر ہماری نگرانی کرنا ایک فطری بات ہے"۔ طیب نے کہا تو راحت حسین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "لیکن اصل مسئلہ تو اب طاہر کو تلاش کرنا ہے کیونکہ اتنی دیر میں اسے واپس آجانا چاہیے تھا یا کم از کم فون پر ہی اطلاع دے دینی چاہیے تھی۔ اگر وہ دہشت گردوں کے ہاتھ آگیا ہے تو یہ انتہائی پریشان کن بات ہے۔ کیونکہ اس مرتبہ ہمارا واسطہ ایک انتہائی خطرناک گینگ سے ہے"۔ راحت حسین نے

متفکر لہجے میں کہا۔

"اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت وہ ہے کہاں؟ اگر اس بارے میں کچھ نشاندہی ہو جاتی تو ریڈ کر کے اسے مجرموں کے چنگل سے نجات دلائی جا سکتی تھی" طیب نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

"اس سلسلے میں تمہیں تھوڑا سا اشارہ دیتا ہوں۔ ہماری خفیہ پولیس نے کافی کوشش کے بعد پتا چلایا ہے کہ ہوٹل مون سٹار اور ہوٹل سن شائن میں کچھ عرصے سے چند مشکوک افراد دیکھے جا رہے ہیں۔ تم لوگ ہوٹل مون سٹار کی نگرانی کرو اور مشکوک افراد کا تعاقب کرو جب کہ میں خود ہوٹل سن شائن کی ٹوہ لیتا ہوں" راحت حسین نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ "او کے' میں اور طارق ابھی روانہ ہوتے ہیں" طیب نے کہا۔ "مگر مجرم ہماری شکلوں سے واقف ہو چکے ہیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ بھیس بدل کر ان کی ٹوہ لگائیں"۔ طارق جو اب تک خاموش بیٹھا تھا اچانک بول پڑا۔

"اوہ۔ ویری گڈ' اپنا جمبو تو خاصا ذہین آدمی ہے۔ تم لوگ ایسا کرو کہ نقلی مونچھیں اور لمبے بالوں والی وگ لگا لو۔ اس طرح تم بہی نظر آؤ گے"۔ راحت حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم بھیس بدل کر ابھی روانہ ہو جاتے ہیں"۔ طیب نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "او کے' خدا حافظ" راحت حسین نے کہا اور چلا گیا جب کہ طیب اور طارق ہوٹل مون سٹار جانے کے لیے تیار ہونے لگے۔

طاہر کے لاشعور میں ہلکی سی روشنی چمکی اور روشنی کا یہ نقطہ پھیلتا چلا گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ پلکیں جھپکنی شروع کر دیں۔ چند ہی لمحوں بعد اس نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں۔ اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ اندھیری کوٹھڑی میں قید ہو اور اس کے کانوں میں ہلکا سا شور سنائی دے رہا ہو۔ جونہی اس کا شعور پوری طرح بیدار ہوا اس نے دیکھا کہ وہ کسی کار کی ڈگی میں بند ہے اور کار تیز رفتاری سے چلی جا رہی ہے۔ شور اصل میں کار کے انجن کا تھا۔ طاہر کے ہاتھ چونکہ پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ زیادہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اسے ایک منظر یاد آ گیا۔ اس نے ایک غنڈے کی کنپٹی پر ہتھیلی کا وار کر کے اُسے بے ہوش کر دیا تھا کہ اتنے میں دو اور آدمی اندر گھس آئے اور انہوں نے طاہر کو جکڑ کر اس کے سر پر پسٹل کے دستے سے وار کیے تھے جس کے نتیجے میں وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی طاہر کو اپنے سر میں ٹیسیں سی اُٹھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اُس کے ہاتھ چونکہ بندھے ہوئے تھے اس لیے وہ سر پر ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ تاہم اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سر پر اچھا خاصا گومڑا ابھر آیا ہے۔ اسے سر میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ طاہر نے اپنے پیچھے بندھے ہاتھوں کی انگلیوں کو حرکت دینی شروع کر دی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کے ہاتھوں کے گرد باندھی گئی رسی کی گرہیں زیادہ سخت نہیں ہیں اور اگر وہ تھوڑی سی جدوجہد کرے تو اس بات کا امکان تھا کہ شاید گرہ کھل جائے۔ لہٰذا اُس نے انگلیوں کی مدد سے گرہ کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس کی انگلیاں چونکہ قدرتی طور پر لمبی تھیں اس لیے یہ بات اس کے لیے خاصی معاون ثابت ہوئی۔ گرہ پوری طرح تو نہ کھلی لیکن کچھ ڈھیلی ضرور پڑ گئی۔ اتنے میں کار رکنے کی آواز آئی اور طاہر نے گرہ کو مزید کھولنا چھوڑ دیا۔ کار کے ہارن کے ساتھ ہی کوٹھی کا گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اب کار کوٹھی کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ پھر کار کے رکنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی مختلف لوگوں کے بولنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ کار کی ڈگی کھولی جانے لگی تو طاہر نے آنکھیں بند کر لیں اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ ابھی تک بے ہوش ہو۔ کار کی ڈگی کھول کر ایک آدمی اس میں جھکا۔ "کم بخت ابھی تک بے ہوش ہے" اسی آدمی کی بڑبڑاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ پھر اس آدمی نے اسے کھینچ کر ڈگی سے باہر نکالا اور دوسرے آدمی کے ساتھ اٹھا کر ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں پہنچتے ہی انہوں نے بڑی بے دردی سے اسے فرش پر پٹخ دیا۔ طاہر کو شدید چوٹ لگی لیکن اس نے ضبط کیے رکھا تاکہ وہ یہی سمجھتے رہیں کہ وہ بے ہوش ہے۔ قدموں کی آواز باہر کو جاتی ہوئی محسوس کر کے طاہر نے اندازہ لگایا کہ دونوں آدمی کمرے سے باہر چلے گئے ہیں۔ کچھ دیر تک وہ خاموش پڑا رہا پھر اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو فرنیچر سے عاری تھا۔ البتہ ایک طرف دیوار پر اس قدر خوفناک آلات لٹک رہے تھے کہ جنہیں دیکھ کر ہی طاہر کو جھرجھری آگئی۔ اسے یہاں سے فرار کی کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور اختیار کرنی تھی۔ اُس نے اپنی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کو حرکت دینی شروع کر دی اور جس گرہ کو وہ دوران سفر کچھ حد تک کھول چکا تھا اُسے انگلیوں کی مدد سے دوبارہ کھولنا شروع کر دیا۔ اسے یہ محسوس کر کے انتہائی خوشگوار حیرت ہوئی کہ گرہ آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہو گئی تھی۔ طاہر نے پوری طرح کھولنے کی بجائے گرہ اتنی ڈھیلی ضرور کر دی کہ وقت آنے پر وہ جونہی جھٹکا دے تو رسی کھل جائے۔ اب وہ اس ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ آیا وہ فوری طور پر یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے یا ابھی مناسب وقت کا انتظار کرے۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور کرخت چہرے والے دو چست سے آدمی اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک کنعان تھا۔ ”اچھا تو آگیا ہے اسے ہوش“ کنعان نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پوری قوت سے ٹھوکر طاہر کی پسلیوں میں رسید کر دی۔ طاہر درد کی شدت سے بلبلا اٹھا۔

”ہونہہ۔ بڑے جاسوس بنے پھر رہے ہیں۔ دو چار انٹرویو اخبار میں شائع ہو گئے ہیں اور اب یہ ہنٹر والے ہمارا پیچھا کر رہے ہیں“۔ کنعان نے انتہائی نخوت سے کہا۔

”عبید! ہنٹر لے کر اس لڑکے کی کھال ادھیڑ دو“۔ کنعان کی دوبارہ کرخت آواز گونجی دوسرے آدمی نے دیوار پر سے ہنٹر کھینچ لیا اور طاہر کے سر پر پہنچ گیا۔ اب سوائے ایکشن میں آنے کے طاہر کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کو جھٹکا دیا اور رسیاں فوراً کھل گئیں۔ اس سے پہلے کہ عبید کا ہنٹر والا ہاتھ حرکت میں آتا' طاہر کی ٹانگیں پوری طاقت سے اس کی پنڈلی پر پڑیں اور وہ اُلٹ کر پیچھے جا گرا۔ دفعتاً طاہر کو خیال آیا کہ اس کی پینٹ میں پسٹل موجود تھا' اس نے بجلی کی سی تیزی سے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا مگر بدقسمتی سے اس کی جیب خالی تھی۔ یقیناً مجرموں نے بے ہوشی کے دوران اس کی تلاشی لی ہو گی اور پسٹل نکال لیا ہو گا۔ اتنے میں عبید طاہر پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ وہ طاہر کو لیتا ہوا دیوار تک جا پہنچا اور دوسرے ہی لمحے اس نے طاہر کا

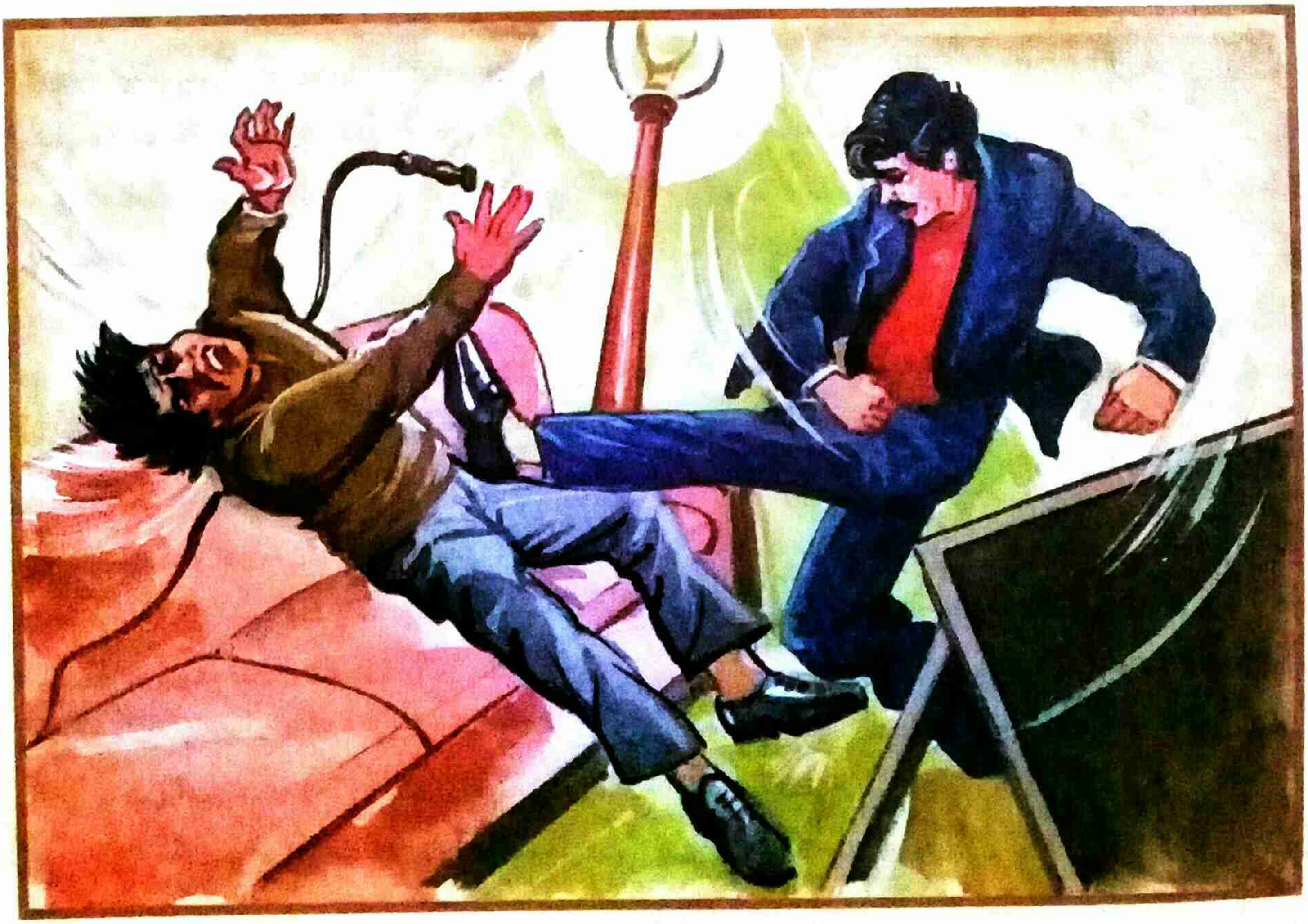

سر دیوار کے ساتھ رگڑ دیا۔ ایک تو طاہر کے سر پر پہلے سے گومڑا ابھرا ہوا تھا اور اب زور سے رگڑ لگنے سے اسکے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ پھر اچانک اس کا ہاتھ عبید کے کوڑے والے ہاتھ پر پڑا اور اس نے زور سے اس کا کوڑا کھینچ لیا۔ عبید کی گرفت کوڑے پر چونکہ زیادہ مضبوط نہ تھی اس لیے کوڑا طاہر کے ہاتھ میں آگیا۔ دوسرے ہی لمحے شڑاپ شڑاپ کی آواز سے کمرہ گونج اٹھا۔ ہنٹر کی ضربیں عبید کے چہرے پر پڑیں اور اس کی چیخوں سے کمرہ گونج اٹھا۔

طاہر کی توجہ اس دوران میں کنعان سے ہٹ گئی تھی اور وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ کنعان نے پسٹل نکال لیا ہے۔ جونہی طاہر نے عبید پر ہنٹر چلایا کنعان نے طاہر پر پسٹل سیدھا کر کے گولی چلادی۔

خوفناک آواز کے ساتھ گولی طاہر کے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ "ہاتھ اٹھاؤ ورنہ شوٹ کر دوں گا"۔ کنعان نے انتہائی کرخت آواز میں کہا اور طاہر نے مجبوراً ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ اتنے میں نیچے پڑے ہوئے عبید نے پتا نہیں کیا چیز اٹھا کر طاہر کے سر پر رسید کی کہ اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی کھوپڑی دو حصوں میں تقسیم ہو چکی ہو اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن پر اندھیرے چھاگئے۔

طیب کے چہرے پر انتہائی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ سٹیئرنگ اس کے ہاتھوں میں تھا اور کار آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پر طارق براجمان تھا۔ دونوں نے اپنے حلیے تبدیل کیے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے ہوٹل مون سٹار پہنچنا تھا۔ جس کے بارے میں راحت حسین نے انہیں ہدایات دی تھیں کہ وہاں آنے والے چند مشکوک افراد کو ٹریس کرنا ہے۔ طیب' طاہر کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس کے بارے میں ابھی کوئی پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ اس نے طارق کی طرف دیکھا۔ اس نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا رکھا تھا اور لمبے لمبے خراٹے لینے میں مصروف تھا۔ طارق کو چونکہ دادا جان کی خاص شفقت اور حمایت حاصل تھی اس لیے وہ گھر بھر میں منہ چڑھا مشہور تھا۔ بعض اوقات تو وہ طیب اور طاہر کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اب بھی وہ اردگرد کے ماحول سے بے نیاز بڑی اونچی آواز میں خراٹے بکھیرنے میں مصروف تھا۔ طیب اس لیے کار آہستہ ڈرائیو کر رہا تھا تاکہ اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیتا رہے۔ حالات اس طرح ہو گئے تھے کہ اسے چاروں طرف سے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے تھے۔ ایک موڑ مڑتے ہی اچانک طارق نے زور دار چھینک ماری اور ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ "روکو کار روکو" اس نے چیختے ہوئے کہا اور طیب نے گھبرا کر بریک لگادی۔

"کیا مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔ بچوں کی طرح چیخ رہے ہو"۔ طیب نے غصے سے کہا۔

'طاہر بھائی یہیں کہیں' قریب ہی موجود ہے"۔ طارق نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے کہا۔ جیسے وہ کوئی چیز سونگھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تمہارا دماغ خراب ہے یہ مصروف سڑک ہے۔ گاڑیاں ہی گاڑیاں گزر رہی ہیں۔ یہاں طاہر کہاں سے آگیا"۔ طیب نے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہماری دادی اماں مرحومہ اللہ ان کی مغفرت کرے' فرمایا

کرتی تھیں کہ جب نیند میں چھینک آئے تو ضرور آپ کا کوئی بچھڑا ہوا دوست یا ساتھی آپ کو ملنے کے لیے آرہا ہوتا ہے"۔ طارق نے بدستور زور زور سے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں کس طرح کے توہم پرست لوگوں سے واسطہ پڑ گیا ہے"۔ طیب نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "دل کی دھڑکن بھی خاصی تیز ہو گئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ طاہر بھائی واقعی کہیں قریب موجود ہے"۔ طارق نے طیب کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا اور اس سے پہلے کہ طیب کچھ کہتا وہ کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ساتھ والی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔ "یہ جبو نامراد مروائے گا"۔ طیب نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ کار سائیڈ پر کر کے روک دی اور طارق کے پیچھے چل پڑا۔ ابھی طیب اس سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ طارق نے کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ کوٹھی کے گیٹ میں سے ایک محافظ نے باہر جھانکا۔

"اے مسٹر ہمارا آدمی یہاں اندر ہے اسے باہر نکالو!" طارق نے اس آدمی سے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "کیا بک رہے ہو تم کون سے آدمی کی بات کرتے ہو؟" محافظ نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی وہ طارق کو گریبان سے پکڑ کر اندر گھسیٹنے لگا۔ "پولیس' پولیس' ہم سپیشل پولیس کے آدمی ہیں۔ طارق نے چیختے ہوئے کہا مگر محافظ نے ایک نہ سنی اور طارق کو اندر گھسیٹ کر گیٹ بند کر دیا۔ طیب چونکہ ابھی گیٹ سے کچھ فاصلے پر تھا اس لیے محافظ کی ابھی اسی پر نظر نہیں پڑی تھی۔

"اس جبو بیوقوف نے نئی مصیبت میں ڈال دیا"۔ طیب نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ کال بیل بجا کر محافظ کو باہر بلائے اور اسے سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کرے۔ لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ جو آدمی سپیشل پولیس کا نام سننے کے باوجود طارق کو گھسیٹ کر اندر لے گیا وہ اس کی بات بھلا کب مانے گا۔ دوسرے ہی لمحے ایک خیال جھماکے کی طرح اس کے ذہن میں آیا۔ ایک تو محافظ کا حلیہ انتہائی مشکوک تھا اور وہ شکل و صورت سے گارڈ کم اور دہشت گرد زیادہ لگتا تھا اور پھر اس نے جس دیدہ دلیری سے طارق کو اندر گھسیٹ کر گیٹ بند کیا اس سے بھی اس کی یہ حرکت مشکوک لگتی تھی۔ کیونکہ اگر طارق نے یہ کہہ بھی دیا تھا کہ ہمارا آدمی اندر ہے تو اُسے چاہیے تھا کہ وہ طارق کو مطمئن کرتا لیکن اس کے برعکس اس نے طارق کو اندر گھسیٹ کر گیٹ بند کر دیا تھا۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ محافظ ضرور کوئی مشکوک آدمی ہے۔ طیب کو یہ پریشانی تھی کہ کہیں اندر طارق کی مار کٹائی نہ ہو رہی ہو۔ اس نے جلدی سے موبائل نکالا اور راحت حسین کو فون کرنے لگا۔

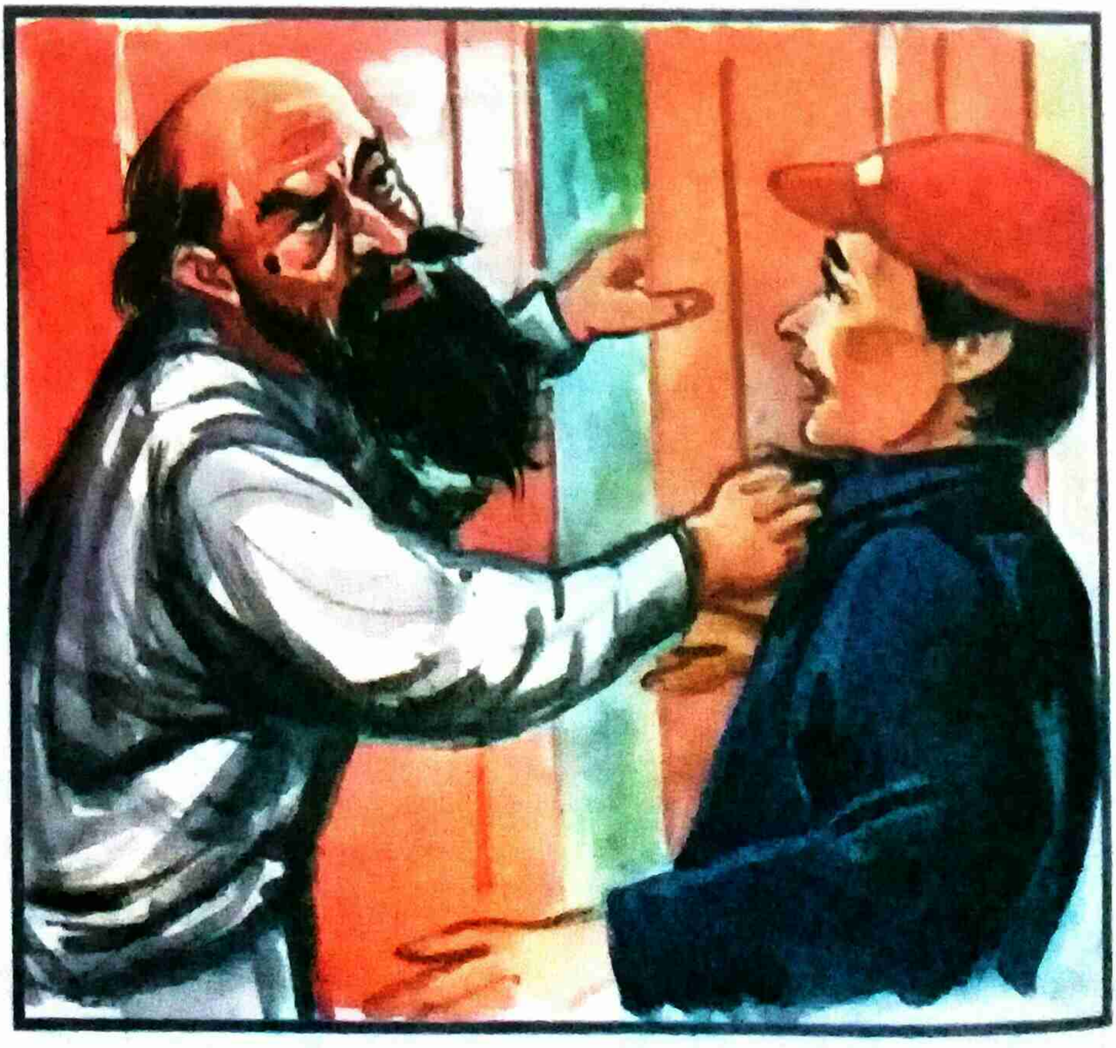

(اس کے بعد کیا ہوا؟
اگلی قسط میں ملاحظہ کیجئے)

☆☆☆

بلاعنوان

اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتابیں لیجیے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 مارچ 2003ء

فروری 2003ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے بے شمار عنوان موصول ہوئے جن میں سے جج صاحبان کو مندرجہ ذیل 6 عنوانات پسند آئے اور ان کے مطابق بذریعہ قرعہ اندازی یہ 6 ساتھی انعام کے حق دار قرار پائے۔

★ علی حسنین، ملتان ("چوہے سے بچے، پنکھے پر لٹکے": پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)
★ انعم مہوش، کلیال ("محترمہ! چوہیا ہے کوئی شیرنی نہیں!" دوسرا انعام: 95 روپے کی کتابیں)
★ انعم ملک، مانسہرہ ("واہ رے چوہے تیری کیا بات ہے!" تیسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)
★ زاہد حشمت، کراچی ("دیکھی میری دہشت!" چوتھا انعام: 80 روپے کی کتابیں)
★ فیصل اقبال، راولپنڈی ("ڈرتے کو پنکھے کا سہارا" پانچواں انعام: 75 روپے کی کتابیں)
★ مزمل حسین، روڑہ ("سرتی کیا نہ کرتی" چھٹا انعام: 60 روپے کی کتابیں)